پاک و ہند جنگ
۱۹۶۵ء

محمد اصغر خان

پاک و ہند جنگ

۱۹۶۵ء

محمد اصغر خان

ترجمہ: زہیر صدیقی

ناشر :- سمیع جبّار

طابع :- محمدؐ عزیز اللہ صدیقی

مطبع :- آدم پرنٹرز، جاوید ہاؤس جعفر فدو روڈ کھارادر کراچی

باراوّل :- جون ۱۹۷۹ء

اشاعتی ادارہ اور تقسیم کار :- ڈائمینشن

وکٹوریہ چیمبرز ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی ۳ فون :- ۵۱۴۰۶۸

کیبل :- ڈائمینشن

اصل کتاب **THE FIRST ROUND** کے نام سے
ایئر مارشل (ریٹائرڈ) محمدؐ اصغر خان نے انگریزی میں
تحریر کی اردو ترجمہ زہیر صدیقی نے کیا
الطاف گوہر کے لکھے ہوئے انگریزی پیش لفظ کا
ترجمہ محمدؐ علی صدیقی نے کیا



محمد اصغر خان

فہرست

پیش لفظ

یہ کتاب سنہ ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ پر موجود تحریری مواد میں ایک اہم اور مستند اضافہ ہے۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ اس تصنیف کا وسیع مُطالعہ خاص طور پر پاکستان میں کیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ کتاب بطور ایک اہم ذاتی شہادت بنظر غائر مطالعہ کی حقدار ہے۔

اس کتاب کے مصنّف ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان جنگ کی تاریخ نگاری کے سفر پر گامزن نظر نہیں آتے، نہ ہی وہ جنگ کے واقعات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں وہ ہمارے روبرو اپنے تاثرات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان حقائق پر سے پردہ اٹھاتے ہیں جن سے انہیں اس جنگ سے پہلے اور اس کے دوران دوچار ہونا پڑا اور وہ اس کام سے سادہ، قابلِ مطالعہ اور مؤثر انداز میں عہدہ برآ ہوئے ہیں اس تصنیف کے مندرجات از حد معلومات افزا ہیں اور یہ بات جس قدر بیان کردہ واقعات کے بارے میں درست ہے، اس کتاب کے بین السطور ان کہے حصّہ کے بارے میں بھی اسی قدر ٹھیک ہے۔ یہ کتاب سنسنی خیز انکشافات اور بڑے بڑے دعوؤں سے خالی ہے۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا بیشتر حصّہ ہمارے تجربہ کا خاصہ مانوس حصّہ ہے اس تصنیف میں جو بات اسے اس موضوع سے متعلق سرکاری مواد (دستاویزات) یا دوسری

پاکستانی تصنیفات سے ممیّز کرتی ہے وہ ہے کتاب کے مصنّف کی خلوص مند صاف گوئی اور حقائق سے متعلق دیانتداری کا رویّہ۔

مصنّف کسی مقام پر بھی اپنی معلومات کے بارے میں غلو کا شکار نہیں ہوتا۔ بس اسی قدر بیان کرتا ہے جس قدر جانتا ہے اور نہ ہی وہ حقائق کو اس انداز سے پیش کرنا چاہتا ہے کہ نتیجتاً اس کا کردار زیادہ چمکدار نظر آئے۔ یہ ایک ایسی تحریص ہے جس کے دام سے ادبا اور سیاستدان شاذونادر ہی بچ پاتے ہیں۔ مثلاً اصغر خان پیکنگ میں صدر ایوب اور چینی رہنماؤں کے اہم اجلاس میں شریک نہ تھے جس کا انہوں نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے "سوویت یونین کی پیش کش کے متعلق ایوب خان اور چینی رہنماؤں کی گفتگو میری موجودگی میں نہیں ہوئی"۔ اس نوع کے بیان کی قطعیت اور صداقت ہی اس تصنیف کی قدر و قیمت میں خصوصی اضافہ کا سبب ہے۔

مصنف نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ممکن ہوا تو وہ کتاب کی آئندہ طبع میں بہت سے دیگر واقعات کے اضافے کی بابت غور کریں گے۔ وہ اپنی کتاب کے ابتدائیہ میں ایک قابل توجہ وضاحت فرماتے ہیں۔ "مجھے اُمید ہے کہ کچھ اور وقت گزرنے کے بعد جب احساسات کی تلخی کم ہو چکی ہو گی، وہ اشاعت پیش کر دی جائے گی جس میں ایک ایسی جنگ کا زیادہ متوازن نقشہ سامنے آئے گا جو بظاہر بے مقصد لڑی گئی" ہمارے سامنے تا حال ایسی کوئی تحریر نہیں آئی ہے۔ جس سے کوئی غیر جذباتی مبصر یہ محسوس کرے کہ اس جنگ کے پس پشت کوئی بڑا اصول یا نظریہ کارفرما تھا اور ابھی تک ایسی کوئی شہادت بھی نظر سے نہیں گزری جس کی بدولت یہ تسلیم کیا جا سکے کہ سیاسی، سفارتی یا پیشہ ورانہ سطحوں پر سے کسی ایک سطح پر بھی

جنگی حکمت عملی کی منصوبہ بندی کی گئی ہو۔

اس کتاب کے مندرجات سے عیاں ہو جاتا ہے کہ "آپریشن جبرالٹر" کی تفصیلات اور دفتر خارجہ و جنرل ہیڈ کوارٹرز کی سوجھ سے اصغر خان کو جو اس وقت پاکستانی فضائیہ کے کمانڈر انچیف تھے بے خبر رکھا گیا تھا انہوں نے اپنے عہدہ کا چارج جولائی ۱۹۶۵ء میں دے دیا تھا۔ اس وقت "آپریشن جبرالٹر" پر عمل درآمد شروع ہونے ہی والا تھا۔ اس "آپریشن" کی ساری حکمت عملی طے ہو چکی تھی اور جنرل ہیڈ کوارٹرز اس امکان کو سرے سے خاطر ہی میں نہ لایا تھا کہ "جبرالٹر" ہندوستان کے ساتھ جنگ پر منتج ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ حکومت پاکستان جنگ کے دوران فضائیہ کی قیادت اصغر خان کے سپرد نہیں رکھنا چاہتی تھی اگر جنگ کا دور دور تک بھی کوئی امکان تھا تو بھی اصغر خان کو اعتماد میں لینا ضروری تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا یا پھر دوسری صورت یہ ہی ہو سکتی ہے کہ یہ کوئی مجرمانہ سازش تھی جس میں اصغر خان کی شمولیت کا راستہ روک دیا گیا تھا۔ بہرحال یہ کوئی فیصلہ کی غلطی نہ تھی ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ ڈر ہو کہ اصغر خاں اس منصوبہ سے آگاہ ہو گئے تو پھر شاید پورے منصوبہ یا اس کے نتائج کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

اس سلسلے میں صرف ایک ہی تاویل کی جا سکتی ہے کہ دفتر خارجہ اور جنرل ہیڈ کوارٹرز نے شاید یہ فیصلہ کیا ہو کہ اصغر خان فضائیہ کے سربراہ رہے تو کہیں وہ اس "آپریشن" کو ایک مثبت اور فیصلہ کن خد و خال نہ دے دیں۔ کیونکہ کشمیر کے مسئلہ کی بابت ان کا خلوص اور ہندوستان کے ساتھ جنگ کے بارے میں ان کے رویہ سے یہی توقع رکھی جا سکتی تھی اصغر خان کی طرف سے اس کتاب میں دھیمے پن کے باوجود ایک بات اظہر من الشمس

ہے کہ ان کے یہاں اس بات کا شدید افسوس دب نہیں سکا ہے کہ وہ ایسے نازک موقع پر خدمت نہ کر سکے" اُس وقت جب جنگ کا سایہ منڈلا رہا تھا یہ بات مجھے چبھنے لگی کہ میری حیثیت محض ایک عام سویلین تماشائی سے کچھ مختلف نہیں" انہوں نے پاکستانی فضائیہ کو "اس کڑی آزمائش" کیلئے اٹھارہ سال تک تیار کیا تھا۔ اور جب وقت آیا کہ وہ "فضائی ضرب و حرب کے اپنے نظریات" کو آزمائیں تو وہ فضائیہ کی سربراہی سے سبکدوش ہو چکے تھے ان کیلئے فضائیہ صرف ایک کیریئر ہی نہ تھی یہ پوری زندگی اور ایک نصب العین تھی انہیں احساس تھا کہ اس فضائیہ کی خدمت کے دوران انکے دو بھائیوں نے جام شہادت نوش کیا تھا انہوں نے ایوب خان سے ملاقات کی اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ پاکستانی فضائیہ میں دوبارہ شمولیت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایوب خان نے سوال کیا کہ کیا وہ کمانڈر انچیف کی حیثیت میں واپس آنا چاہتے ہیں" میں نے جواب دیا کہ میری پیش کش کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ یہ قسمت کی بات تھی کہ حالات نے جب یہ سنگین صورت اختیار کی اس سے چند ہی دن پہلے میں فضائیہ کی کمان سے سبکدوش ہو گیا اور میرے جانشین کے ساتھ یہ ناانصافی ہو گی کہ میں ان کی جگہ لے لوں۔ میں نے کہا کہ میں خوشی سے کسی ایسی حیثیت میں خدمت پر آمادہ ہوں جہاں میرا تجربہ کام آ سکے" ان کا خیال تھا کہ ملک کو ان کی ضرورت ہے۔ انہیں اس امر پر بھی کوئی گلہ یا شکایت نہیں تھی کہ انہیں فضائیہ کی سربراہی کے زمانے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اس بات چیت کی تاریخ ۴ ستمبر ۱۹۶۵ء تھی۔ یعنی ہندوستان کی جانب سے بین الاقوامی سرحد عبور کرنے اور لاہور پر حملہ سے دو روز پیشتر دریں اثنا ذوالفقار علی بھٹو جو اس زمانے میں وزیر خارجہ تھے، حکومت کو یہ باور کرا چکے تھے "آزاد کشمیر میں پاکستان کی پیش قدمی کے جواب میں ہندوستان

لڑائی کا میدان پاکستان کی سرحدوں تک پھیلانے سے گریز کرے گا۔" اصغر خان کے علم میں "آپریشن جبرالٹر" کی پوری تفصیلات نہیں لائی گئیں۔ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ انہیں قصداً لاعلم رکھا گیا۔ انہوں نے ۴ ر اور ۵ ر ستمبر کے دن فضائیہ کے ہیڈکوارٹرز میں گذارے اور پھر یہ فیصلہ کیا "۶ ر ستمبر کی صبح کو میں کراچی لوٹ جاؤں" لیکن حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے پروگرام تبدیل کر دیں۔ اگرچہ حکومت کے کسی ایک فرد نے بھی حالات کی سنگینی کے پیش نظر راولپنڈی میں قیام کرنے کے لئے نہیں کہا۔ اس کے بعد چینی وزیراعظم چو این لائی کے ساتھ اپنی بات چیت رقم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔ "انہیں یا مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ دس دن میں پاکستان کسی شرط پر بھی جنگ ختم کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔" یہ ہی اظہارِ حیرت اس لمحہ بھی موجود نظر آتا ہے۔ جب وہ ترکی اور ایران کے مشن کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں۔

لیکن آٹھویں باب میں شاید سب سے واضح اظہارِ خیال موجود ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے "پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات کے معاملے میں صدر ایوب کا رویہ نہایت محتاط رہا تھا۔ اور ہندوستان سے رابطوں کے بارے میں یہ احتیاط خاص طور پر نمایاں تھی اس لئے مجھے یقین نہ آتا تھا کہ انہوں نے ایک ایسی حکمتِ عملی منظور کر لی ہے جس میں ہندوستان سے ایک بھرپور جنگ کا سامان پوشیدہ ہے۔ اگست ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں ہم نے اخبارات میں پڑھا کہ آزاد کشمیر کے رضاکار جنگ بندی لائن توڑ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب ان حملوں کی شدت بڑھنے لگی تو یہ ظاہر ہو گیا کہ کشمیر کے معاملے میں ہماری پالیسی میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔"

اصغر خان نے مقبوضہ کشمیر میں رضا کاروں کی مداخلت کے بارے میں پڑھا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان کی حکمت عملی میں بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ پاکستان فضائیہ کی سربراہی سے سبکدوش ہونے کے چھ ہفتوں کے اندر اندر ہوا۔ اس بات سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت میں ایک ایسا گروہ موجود تھا جس نے یہ مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اصغر خان کو کشمیر میں ہونے والے آپریشن کے بارے میں کلیدی اطلاعات بہم نہیں پہونچنے دیں گے بحیثیت کمانڈر انچیف پاکستان فضائیہ اصغر خان اس بات کے حقدار تھے کہ ان اطلاعات کی ان تک رسائی ہو۔

صرف اصغر خان ہی ایک ایسے افسر نہ تھے جنہیں یہ در پردہ باتیں جاننے کا حق تھا بلکہ اس زمانے میں ایک خفیہ کمیٹی قائم تھی جسے کشمیر سلیسٹی کمیٹی جیسا خوبصورت نام دیا گیا تھا۔ جس کے صدر وزارت امور خارجہ کے سیکریٹری عزیز احمد تھے اور کمیٹی کشمیر کے بارے میں پاکستان کی حکمتِ عملی پر بحث وتمحیص کی غرض سے بڑی عجیب عجیب جگہوں پر اجلاس کیا کرتی تھی۔ مجھے اس کمیٹی کی موجودگی کے بارے میں اتفاقاً ہی علم ہو پایا اور تعجب ہوا کہ مجھے اس کمیٹی کے اجلاس کی روئیدادوں کے بارے میں کیوں لاعلم رکھا گیا۔ ہر چند کہ انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ کے سیکریٹری کی حیثیت سے اس کمیٹی کی روئیدادوں کے بارے میں واقفیت میرے فرائض منصبی میں سے ایک کام تھا۔

جب میں نے ایوب خان کی توجہ اس فروگذاشت کی جانب مبذول کرائی، تو

انہوں نے فوراً ہی مجھے اس کمیٹی میں نامزد کر دیا۔ اس کمیٹی میں میری شمولیت کی وجہ سے عزیز احمد پر کچھ عجیب ناقابل ادراک اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ صدر اُن سے مشورہ کئے بغیر کمیٹی میں کسی شخص کی نامزدگی کے مجاز نہیں ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہی وہ کمیٹی ہے جس کے ذریعہ دفتر خارجہ کشمیر کے متعلق اپنے سارے منصوبے تیار کیا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۶۴ء کے آخر میں دفتر خارجہ اور انٹر سروسیز انٹیلی جینس ڈائریکٹریٹ نے ایک "پیپر" تیار کیا تھا جو آگے چل کر "آپریشن جبرالٹر" کی بنیاد بنا۔ اُس وقت اُسے ایوب خاں نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سنہ ۱۹۶۴ء کے آخری دنوں میں "کشمیر آپریشن" کے بارے میں بہت سرگرمی سے غور و خوض کیا جا رہا تھا۔ یہ بات کہ وزارت اطلاعات و براڈکاسٹنگ کے سیکریٹری سے "کشمیر پبلسٹی کمیٹی" کی روئیداد میں مخفی رکھی گئیں زیادہ اہم نہیں ہے لیکن یہ کہ دفاعی منصوبہ بندی جیسے کام سے پاکستان فضائیہ کے سربراہ کو لاتعلق رکھا گیا ناقابل تفہیم بات ہے۔ ایسے ماحول میں جب اصغر خاں ۲ ستمبر کو موقعہ پر موجود پائے گئے تو دفتر خارجہ اور جنرل ہیڈ کوارٹرز کافی جز بز ہوئے ظاہر ہے کہ اصغر خاں کو فضائیہ کے ہیڈ کوارٹرز سے باہر چلے جانے کے لئے کیونکر کہا جا سکتا تھا لیکن بہر حال کمان ایک اور شخص کے ہاتھ میں تھی اور اصغر خاں کی بیچارگی فضائی حملے کا حکم دیتے وقت کی کارروائی سے معلوم ہوتی ہے۔ اصغر خاں چاہتے تھے کہ ہندوستانی حملہ کا انتظار کئے بغیر حملہ شروع کر دیا جائے" اس موقعہ پر میں نے اپنا یہ نقطہ نظر پھر واضح کیا لیکن

اب فضائیہ کی کمان میرے ہاتھ میں نہ تھی اور میں اپنا فیصلہ حکماً نافذ نہ کر سکتا تھا۔ بہرحال میں نے جو لائحہ عمل تجویز کیا میری نظر میں صرف وہی ایک تھا جو ہم بخیر وخوبی اختیار کر سکتے تھے"۔ یہ فیصلہ کئی گھنٹوں کی تاخیر سے ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اصغر خاں فضائیہ کے ہیڈکوارٹرز میں بیٹھے ہوئے حملہ کرنے کے وقت کے بارے میں حساس بحث میں حصّہ لے رہے ہیں لیکن اِس کے باوجود حکومت ان کے لئے کوئی رسمی عہدہ تجویز نہیں کرتی۔ بس وہ وہاں اپنی ذات کی وجہ سے تھے اور ان کی واحد اتھارٹی فضائیہ کے عملے میں ان کے لئے ذاتی وفاداری اور خلوص کا جذبہ تھا۔ اِس کے بعد وہ چین، انڈونیشیا، ایران اور ترکی گئے تاکہ اسلحہ کی ضروری سپلائی کا بندوبست کیا جا سکے۔ ابھی وہ اس مشن میں مصروف ہی تھے کہ غلام فاروق دفاعی مشیر بنا دیئے گئے۔ دریں اثنا اصغر خاں نے کچھ انٹر سروسز اسٹاف اکٹھا کر لیا تھا جس نے وزارتِ دفاع میں خدمات انجام دینی شروع کر دی تھیں۔ جب وہ پاکستان واپس ہوئے تو انہوں نے غلام فاروق کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور انہیں اپنے مشورہ اور تعاون کی پیش کش کی "میرے خیال میں صورتِ حال قابلِ اطمینان تھی، اور گو کہ ہمیں بعض قسم کے گولہ بارود کی قلت کا سامنا تھا مجھے یقین تھا کہ متعدد بحری جہاز اور پی آئی اے کے بوئنگ اور کانسٹیلیشن طیارے جو سازوسامان لیکر آ رہے تھے اس سے یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ اور ہماری فوجیں ضروری آلات اور

سامان سے محروم نہ ہوں گی۔ جنگ کے باقی دنوں میں ایک خود ساختہ رضاکار منتظم کی حیثیت سے خدمت کرتا رہا اور اس کے اختتام پر کراچی لوٹ گیا"۔ اصغر خان کی روئیداد دو طرح سے معلومات افزا ہے۔ اولاً "آپریشن جبرالٹر" کے خدوخال اُجاگر کرنے کی وجہ سے اور دوم پاکستانی افواج کے جرنلوں اور بریگیڈیروں کے کردار کے مطالعہ کے طور پر۔

"آپریشن جبرالٹر" سے مرحوم میجر جنرل اختر حسین ملک کا نظریہ اور کردار مترشح ہوتا ہے وہ ایک بہادر اور دور کی کوڑی لانے والے افسر تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ منصوبہ اپنے آغاز ہی میں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ بعض "اہم سول مشیروں" نے اس منصوبے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے لیکن ہمیں ان اصحاب کے نام نہیں بتائے گئے پورا منصوبہ تین مفروضات پر تشکیل دیا گیا تھا۔

۱۔ مقبوضہ کشمیر کے عوام زبردست انداز میں لبیک کہیں گے۔

۲۔ ہندوستان اپنے حملہ کو آزاد کشمیر کی حد تک محدود رکھے گا۔ اور ۳۔ اس بات کا دور دور تک احتمال نہیں ہے۔ کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد عبور کرے گا۔ یہ تینوں مفروضات غلط ثابت ہوئے یہ منصوبہ اس لئے ناکام ثابت ہوا کہ اس کی تشکیل میں دشمن خارجہ کی سازش کے عنصر کے علاوہ کمک تنڈوند کے حملوں اور گوریلا سرگرمیوں کے مابین بنیادی فرق ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا تھا۔ اس منصوبے پر عمل پیرائی کے لئے کچھ ایسے عملہ کا انتخاب کیا گیا

تھا جو نہ "مقبوضہ علاقے کے جغرافیہ سے واقف تھا نہ اس کے عوام کی زبان سے"۔ مقبوضہ کشمیر کے غریب دیہاتی، حملہ آور اور اتحادی کے مابین فرق کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس وقت دعویٰ کیا گیا تھا کہ "آپریشن جبرالٹر" غلطیوں سے مبرا ہے چونکہ ہر وہ شخص جو اس "آپریشن" سے متعلق تھا۔ صرف اپنے کام سے واقف تھا۔ اور سوچتا تھا کہ دشمن اس آپریشن کی وسعت اور مقاصد سے بے خبر رہے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب اس آپریشن میں شامل پہلے چار رضاکار ہندوستان کی حراست میں چلے گئے تو انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی ۸ اگست ۱۹۶۵ء کی براڈ کاسٹ میں سارے منصوبے پر سے پردہ اٹھا دیا۔ میں نے اس براڈ کاسٹ کی تفصیل بریگیڈیئر ارشاد کو سنائی۔ جو اس وقت ملٹری انٹیلی جینس کے ڈائریکٹر تھے مجھے اب تک اُن کا تاسف بھرا ردِ عمل یاد ہے "اوہ! ظالموں نے سب کچھ اگل ڈالا" اصغر خان اس منصوبے کی ناکامی کی وجہ کا ذمہ دار اس حقیقت کو ٹھہراتے ہیں "نہ تو منصوبے پر عمل کرتے وقت اس کی رفتار کو بتدریج بڑھایا گیا کہ وہ ایک عوامی بغاوت ظاہر ہو نہ فوجی کارروائی کو اس طرح قابو میں رکھا گیا کہ وہ ہندوستان کے لئے سیاسی یا فوجی نقطۂ نظر سے قابلِ برداشت رہے" اب اس سورش میں اضافہ ناگزیر ہو چلا تھا اور "آپریشن" کشمیر کے اندر معروضی حقائق کے ساتھ ہم آہنگ نہ کیا جا سکا تھا دفتر خارجہ اور جنرل ہیڈ کوارٹرز کا موقف تھا کہ ہندوستان کسی صورت میں بھی بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کریگا۔ "آپریشن اسی مفروضہ پر قائم تھا اسے سازش کی سی صورت دی گئی اور اس پر المناک غفلت شعاری کیساتھ اس "آپریشن" کا دوسرا پہلو

جنرلوں اور بریگیڈیئروں کے کردار سے تعلق رکھتا ہے اور اس سلسلے میں اصغر خان کے خیالات سراسر غیر جذباتی خیال نہیں کئے جا سکتے چونکہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی فضائیہ کے باب میں وہ نہایت واضح اور بہت محبّت بھرے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ جب کبھی پاکستان فضائیہ کا ذکر کرتے ہیں تو بہت فخر و مباہات کے لہجے میں کرتے ہیں۔ جب ۶ ستمبر کو ہندوستانی افواج پاکستانی علاقہ میں داخل ہوئیں "تو ہماری فضائیہ کے وائرلیس آبزرورنگ کے چوکس ممبروں نے انہیں تاڑ کر فوراً دفاعی مرکز کو اس نقل و حرکت کی اطلاع دی۔ فضائی فوج کے اس گراں قدر بازو نے اس سے پہلے بھی ہمیشہ نہایت خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے" وہ شخص جس نے صدر کو ان حرکات سے مطلع کیا وہ ایک ایئرمین ہی تھا۔ اور فضائیہ کے ہیڈکوارٹر نے ہی نے صورت حال کا فی الفور نوٹس لیا تھا۔" جب بری فوج کو دشمن کی کارستانی کا پوری طرح اندازہ بھی نہ ہوا تھا" ۷ ستمبر تک "ہمیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ دشمن کی فضائیہ کو اچھی مار پڑی ہے۔ اگلے دن اس کے ردّ عمل سے ظاہر ہوا کہ ہماری کامیاب کارروائیوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا ہے" جب جنگ کے خاتمے کے قریب نور خان فضائیہ کے طیاروں کے نقصان کی شرح اور افغانستان کی جانب سے عام لام بندی کے اعلان پر فکرمند نظر آرہے تھے۔ اصغر خان کا خیال تھا "ہماری فضائیہ افغانستان کے خلاف اس سے بھی زیادہ مؤثر کارروائی

کر سکتی تھی جو اس نے ہندوستان کے خلاف کی تھی۔" اصغر خان بری افواج کی کارکردگی گھٹا کر بیان نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان کے خیال میں بری افواج کی کارکردگی بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھی۔ ان کے خیال میں بری افواج کی ناکامی کلیتہً دفاعی حکمت عملی اور غیر مؤثر کمان کی وجہ سے تھی۔ مزید یہ کہ محض مدافعت کی پالیسی "تباہی کا راستہ تھی۔ وہ بہت سے مقامات پر تجویز کرتے ہیں کہ جب کبھی بری فوج بالائی سطح کی مداخلت سے محفوظ رہی اس نے بہتر کارکردگی کے نمونے پیش کئے جیسا کہ فیروز پور اور سندھ۔ جودھپور سرحد پر لیکن جنرل ہیڈ کوارٹرز بری افواج سے تحمل اور آہستگی کے رویہ کا طالب تھا" وہ ہمارے جوانوں کے فطری میلانات اور میدان جنگ میں ہمارے کمانڈروں کی رائے کے برعکس تھا" وہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح پہل اور سبقت لے جانے کی ہر درخواست بریگیڈ، ڈویژن اور کور ہیڈ کوارٹرز کے مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی اور جب یہ درخواست ہیڈ کوارٹرز تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو جواب ملتا" حکم کا انتظار کرو" یا "حملہ نہ کرو" اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری فوجوں کی جارحانہ صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ جو کمانڈر فطرتاً بودے تھے۔ وہ اور زیادہ بودے ہو گئے اور جو دلیر تھے انہیں اس احتیاط نے مار دیا جو اوپر سے ان پر مسلط کی گئی تھی" وہ اقرار کرتے ہیں کہ اگر متذکرہ بالا اسباب کے باوجود بری فوج نے کچھ کر دکھایا تو اس پر صرف اظہار حیرت

ہی کیا جا سکتا ہے۔

دشمن کے ٹینکوں کو غیر موثر بنانے کے لئے انفنیٹری کے بجائے "آرمر" سے کام لینے کی صرف یہی وجہ نہ تھی کہ انفنیٹری کم تھی بلکہ "اصل وجہ یہ تھی کہ فوج کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی ان میں نہ قوت تخیّل تھی اور نہ جرأت"۔ کھیم کرن کے علاقہ میں آرمر جھونکنے سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوسکنے کی وجہ غلط وقت کا انتخاب اور ناکافی تیّاری تھی۔ انھوں نے اس نکتہ کی جانب اشارہ نہیں کیا کہ اس سیکٹر میں ایک ایسا پُل تھا جو نئے پاکستانی ٹینکوں کا وزن سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پُل بیٹھ گیا اور پیش رفت گھنٹوں تک رُکی رہی۔ دریں اثنا ہندوستانیوں نے مدھوپور نہر کاٹ دی۔ (ایک ایسی حقیقت جو جنرل ہیڈ کوارٹرز کے علم میں نہیں تھی) اور ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر پورا علاقہ پانی سے بھر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کھیم کرن پاکستانی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔

درحقیقت یہ کتاب ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی فوجی حکمت عملی کا جائزہ لینے کی جانب پہلی سنجیدہ کوشش ہے اور اس میں منصوبہ بندی اور آپریشنل چالوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس ساری کوشش کا ماحصل یہ ہے کہ افواج پاکستان کے باہر یہ بات صرف چند افراد کے علم میں ہے کہ پاکستان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ناکافی تیاری، احمقانہ مفروضات اور دفتر خارجہ کے مجرمانہ مشورہ "ایڈوائس" کی وجہ سے

تباہی کے دہانے کے کس قدر نزدیک آن لگا تھا۔ بہت سے حقائق تاہنوز پردۂ اخفا میں ہیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے۔ کہ رن کچھ کی لڑائی کے فوراً بعد بہت سے جرنلوں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ اُن کی زمینوں پر سے جلد از جلد بارودی سُرنگیں ہٹالی جائیں چونکہ اُن کی فصلوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ۱۹۴۸ء کی جنگِ کشمیر کی ایک مکمل اور درست روئیداد تیار نہ کی جاسکی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۶۵ء میں ۱۹۴۸ء کی غلطیاں دُہرائی گئیں اور چونکہ ایّوب خان کے احکامات کے باوجود یحییٰ خان نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا مکمل ریکارڈ تیار نہ کیا تھا۔ اس لئے جنگ ۱۹۶۵ء کی غلطیاں ۱۹۷۱ء میں دہرائی گئیں اور یہی وہ غلطیاں تھیں جو ڈھاکہ میں افواج پاکستان کی بے توقیری اور ہتھیار ڈالنے کے منظر پر منتج ہوئیں۔ اصغر خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے کمانڈ کی سطح پر پاکستان آرمی کی کارکردگی کے بارے میں تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جب تک ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے حقائق روشنی میں نہیں آتے ہمارے عوام غیر حقیقی دنیا میں رہتے رہیں گے اور اپنے دشمنوں پر "تخیلی" فتوحات پاتے رہیں گے

اصغر خاں نے ایوب خان کے ذہن و مزاج کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ میرے اندازے سے مختلف ہے۔ میں نے بھی اُن کے ساتھ ساڑھے پانچ سال بشمول زمانہ جنگ، بہت قریبی حیثیت میں کام کیا ہے جہاں تک "آپریشن جبرالٹر" کا تعلق ہے، مجھے بھی صورتِ حال سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ مجھے اس آپریشن کی بابت ۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو سب سے پہلے اس وقت علم ہوا جب بریگیڈیر

ارشاد نے مجھ سے درخواست کی کہ میں مظفرآباد میں قائم ہونے والے ریڈیو سٹیشن کے لئے ایک کشمیری بولنے والا افسر نامزد کروں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ فوج کے پاس ضروری ساز و سامان موجود ہے اور وہ ایک لمحہ کے نوٹس پر اپنی نشریات کا آغاز کر سکتے ہیں۔ میں نے فوج کے سپرد مرحوم یوسف ظفر (جو ریڈیو پاکستان کے ایک محنتی اور تجربہ کار افسر تھے) کی خدمات پیش کر دیں کچھ روز کے بعد بریگیڈیئر ارشاد نے مجھے "آپریشن جبرالٹر" کے بارے میں کچھ اور معلومات فراہم کیں اور یہ اطلاع دی کہ وہ مجھے اس "آپریشن" کے روز آغاز سے ۲۴ گھنٹے قبل اطلاع دینگے میں اس "آپریشن" کے بارے میں ۸ اگست کی اس صبح تک لاعلم رہا جب بریگیڈیئر ارشاد مجھ سے مری کے ایک ریسٹ ہاؤس میں آکر ملے۔ وہ قدرے پرجوش نظر آرہے تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ "آپریشن" شروع ہو چکا ہے اور انہیں افسوس ہے کہ وہ مجھے ۲۴ گھنٹے کا نوٹس نہ دے سکے وہ جس وجہ سے میرے پاس آئے اس کا سبب یہ تھا کہ مظفرآباد میں فوج کی طرف سے قائم کردہ ریڈیو اسٹیشن اپنی نشریات کے آغاز میں ناکام رہا تھا۔ یہ سنتے ہی میں راولپنڈی روانہ ہو گیا اور میں نے "صدائے کشمیر" ریڈیو کے آغاز کے لئے متبادل انتظامات کئے چند روز بعد سیکریٹری وزارت دفاع کے دفتر میں ایک جلسہ ہوا جس میں آغا شاہی اور نور خان بھی موجود تھے آغا شاہی اس بات پر پریشان تھے کہ دفتر خارجہ مقبوضہ کشمیر میں انقلابی کونسل قائم کرنے میں ناکام رہا ہے اور نور خان مجھ پر زور دے رہے تھے کہ اس خبر کی تشہیر کروائی جائے کہ وہ راجوڑی کے علاقے میں محصور رضا کاروں کے لئے بہ نفس نفیس غذائی سامان

گرائیں گے۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز لاہور، ڈھاکہ اور کراچی کے اخبارات کے مُدیروں سے ملاقات کروں اور انہیں ہنگامی صورتِ حال کے نفاذ کی بابت اعلان کے بارے میں تیار کروں۔ میں اُسی رات ڈھاکہ روانہ ہو گیا اور ۵ کی شب کو کراچی پہنچا میں ۶ ستمبر کی صبح کی پہلی فلائٹ سے اسلام آباد آیا اور جیسے ہی میں ساڑھے نو بجے ہوائی اڈہ پہنچا مجھے لاہور پر ہندوستانی حملہ کی اطلاع ملی۔ میں ایئر پورٹ سے سیدھا ایوانِ صدر گیا۔ دریں اثنا بھٹو، عزیز احمد اور آغا شاہی قوم سے صدر کے خطاب کا مسودہ پیش کر چکے تھے لیکن اسے مُسترد کیا جا چکا تھا جب مجھ سے کہا گیا تو میں نے اصرار کیا کہ میں متبادل مسودہ تحریر کرنے سے پہلے ایوب خان سے ملاقات کروں گا۔ اس وقت ایوب خان اعلیٰ ترین اعتماد کی تصویر نظر آ رہے تھے انہوں نے کہا "ہندوستان والے یہ نہیں جانتے کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے" میرے لئے یہ بات کافی تھی اُن کی تقریر صحیح جذبات کی عکاس تھی اور لوگوں کے دلوں میں اُتر گئی ایوب خان نے میرے مسودہ میں صرف ایک ترمیم کی۔ میں نے لکھا تھا "ہم تقریباً حالت جنگ میں ہیں" انہوں نے لفظ "تقریباً" کاٹ دیا میں نے مشورہ دیا کہ وہ قوم سے اُردو میں خطاب کریں صدر نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور نصف گھنٹے کے اندر خطاب کا اردو روپ تیار ہو کر نشر ہو گیا ایوب خان نے مجھے امریکی سفیر متعینہ پاکستان والٹر پی میکانگی کے ساتھ ملاقات کی روئیداد بتائی جس کے متعلق اصغر خان نے ذکر کیا ہے میکانگی زوردار آواز اور کھُردرے برتاؤ کے لئے مشہور

تھے۔ اور ایوب خان، دوسرے سربراہانِ مملکت اور غیر ملکی سُفرا کے ساتھ دھیمے رویّہ سے پیش آتے تھے۔ دوسری جانب سے اشتعال انگیزی کی صورت میں بھی وہ ٹھنڈے اور نرم رو مزاج کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ملاقات کے دوران میکانگی نے کہا "جنابِ صدر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں نے آپ کے گلہ کو دبوچ لیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو اس دباؤ سے نجات دلوا سکتے ہیں"۔ ایوب خان نے خاموشی سے جواب دیا "دیکھتے ہیں کس نے کس کے گلہ کو دبوچ رکھا ہے" چند روز بعد میکانگی نے ایوب خان سے پھر ملاقات کی اور کہا کہ ایک ایسا انتظام کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان مشرقی پاکستان میں جنگ نہ چھیڑے۔ اس تجویز کو وزارتِ خارجہ کی تائید حاصل تھی امریکیوں نے پاکستانی وزارتِ خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر کے ایم قیصر جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا رابطہ قائم کیا تھا۔ کے ایم قیصر بھٹو کے خاص الخاص راز دار تھے ایوب خان نے اس تجویز کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مسترد کر دیا۔

ایوب خان اس وقت جن حالات میں گرفتار تھے ان کا ناہنوز پوری طرح ادراک نہیں کیا جا سکا ہے۔ اصغر خاں اس خیال کے حامی ہیں کہ ایوب خان بیرونی دباؤ کے سامنے جھک گئے تھے حالانکہ میدانِ جنگ کی غیر اطمینان بخش حالت کے باوجود جنگ جاری رکھی جا سکتی تھی۔ اگر جنگ سے متعلق ساری اطلاعات اور دستاویزات مطالعہ کے لئے بہم ہو جائیں تو اس بات کا امکان ہے کہ اصغر خان اپنے اس فیصلہ پہ نظرِ ثانی کر لیں گے۔ "آپریشن جبرالٹر" کے تمام مفروضات غلط ثابت ہوئے، کھیم کرن کے علاقے میں پیش رفت، پیشہ ورانہ غفلت اور عدم صلاحیت کی بنا پر

ناکامی کا شکار ہو کر رہ گئی ایک نازک لمحہ پر ایوّب خان کو بتایا گیا کہ ایران اور ترکی سے صحیح قسم کا "آرمر" شکن ایمونیشن دستیاب نہیں ہو سکا۔ جب سیکرٹری وزارتِ دفاع نے یہ اطلاع دی تو میں ایوّب خان کے ساتھ۔ اُنہوں نے کہا "میں اِس فروگذاشت کے لئے تمہیں موردِ الزام ٹھہراتا ہوں"۔

برّی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ اپنے ذہن سے کام نہیں لیتے تھے اور وہ "ایوّب خان کے اتباع میں دیر نہ کرتے تھے"۔ جنگ کے دوران جنرل موسیٰ کا "سفر اپنے مکان، دفتر اور جی ایچ کیو کے نقل و حرکت کے مرکز تک محدود رہا" پاکستان فضائیہ کے کمانڈر انچیف ایئر مارشل نور خان "۶ برس تک فضائیہ سے باہر رہنے کے بعد آئے تھے۔ وہ جنگ جاری رکھنے کے اِس لئے مخالف تھے۔ اگر جنگ کچھ عرصہ اور جاری رہی تو لازماً یہ نوبت آ جائے گی کہ اس کے نقصانات کی تلافی نہ ہو اور وہ حرب و ضرب کے لائق نہ رہے گی"۔ نور خان ایسی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے چیلنج سے خوش نہ تھے۔ اور وہ اپنے ماموں نواب آف کالاباغ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس بات کے خواہشمند تھے کہ جس قدر جلد یہ عدم مساویانہ مقابلہ ختم ہو اچھا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹّو نے ایوّب خان کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستان پاک و ہند کی سرحد عبور نہیں کرے گا پیکنگ کے دورہ کے دوران اصغر خان نے بھٹّو سے سوال کیا تھا کہ آیا ایسی کوئی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ بھٹو نے جواب دیا کہ اس کی اساس چین کے وزیر خارجہ مارشل چن ای کے ساتھ اُن کی گفتگو ہے۔ اصغر خان کہتے ہیں "مجھے یقین ہے کہ انہوں (بھٹو) نے یہ اس

اُمید پر کیا کہ جنگ میں پاکستان کو شکست ہو جائے گی۔ اور اس کے باعث ایوب خان کا تختہ الٹ جائے گا۔ پھر ملک میں جو افراتفری ہو گی اس میں ذوالفقار علی بھٹو ہی ہندوستان سے سمجھوتے کی بات چیت کر سکیں گے۔ اور پھر بالآخر وہی ایوب خان کی جگہ صدارت کا منصب سنبھال سکیں گے۔ آج میں ماضی کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو جنگ سے چند دن پہلے اور اس کے دوران مسٹر بھٹو کے رویّہ کے پیشِ نظر مجھے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ انہوں نے عمداً ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جن میں وہ خود اقتدار حاصل کر سکیں اس وقت تو انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی مگر ۶ سال بعد انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ ۱۹۷۱ء میں جب بھٹو دوبارہ پاکستان کے وزیر خارجہ مقرر ہوئے ملک کو ہندوستان سے دوسری جنگ میں شکست ہوئی اور یحییٰ خان کو اقتدار چھوڑنا پڑا اور دنیا نے یہ طرفہ تماشا دیکھا کہ ایک غیر فوجی شخص بیک وقت پاکستان کا صدر، اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوا۔ اس غیر معمولی عمل میں ملک کا ایک حصّہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا، لیکن یہ المیہ بھٹو کے لئے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔"

میری اپنی یادداشت بتاتی ہے کہ بھٹو نے ایک اہم اجلاس میں یہ کہا تھا کہ ان کا دعویٰ آسٹریلوی ہائی کمشنر کی وساطت سے حاصل کردہ یقین دہانی پر مبنی تھا سلامتی کونسل کے اس اجلاس میں جس میں جنگ بندی کا ریزولیشن منظور ہوا تھا، شمولیت کے لئے نیو یارک روانہ ہونے سے دو روز قبل بھٹو نے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ "یقین دہانی ضمانت نہیں ہوتی۔ میں نے تو صرف دفتر خارجہ کی طرف سے صدر پاکستان کو ایک مشورہ دیا تھا۔ جب اس اجلاس میں شامل کچھ افراد نے اُن پر کچھ

تنقید کی تو وہ زور زور سے رونے لگے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے ایک ایسا جملہ ادا کیا جسے میں کسی صورت میں بھی نہیں بھول سکتا۔ "میرا سیاسی کیریئر ختم ہو گیا۔"

عزیز احمد جنگ کے دوران صرف ایک ہی فکر میں گھلتے رہے اور وہ یہ کہ اُن کے علاوہ صدر سے کسی اور شخص کی ملاقات نہ ہو پائے دوران جنگ پاکستان کے ہائی کمشنر متعینہ نئی دہلی میاں ارشد حسین نے جنگ بندی کے بعد ایک اجلاس میں بتایا کہ انہوں نے ۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو نئی دہلی میں ترکی کے سفارتخانہ کے ذریعہ دفتر خارجہ کو پیغام بھجوایا کہ ہندوستان ۶ ستمبر کو لاہور پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ پیغام اسلام آباد میں موصول ہوا لیکن اس سے ایوب خان کو لاعلم رکھا گیا جب عزیز احمد سے اس باب میں استفسار کیا گیا، اُن کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ وہ اس پیغام کا بروقت مطالعہ نہ کر سکے تھے۔

یہ تھے وہ حضرات جو اس زمانے میں ایوب خان کے گرد جمع تھے چین اور انڈونیشیا کے علاوہ دفاعی ہتھیاروں کی سپلائی کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ ایران اور ترکی اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ پاکستان جنگ بندی قبول کر لے۔ یہ بات کہ ایسے حالات میں ایوب خان جنگ جاری رکھ سکتے تھے۔ انفرادی فیصلہ کی متقاضی ہے لیکن اصغر خان نے بہرحال اس حد تک فراخ دلی کا مظاہرہ ضرور کیا ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایوب خان نے پاکستان کے مفاد میں قدم اٹھایا تھا۔ اس کتاب میں بین الاقوامی امور سے متعلق دلچسپ حوالہ جات ہیں اس کتاب کے ایک گہرے اور دور رس پیراگراف میں کہا گیا ہے کہ ہند چین جنگ (۱۹۶۲ء) اور ہند پاک جنگ (۱۹۶۵ء) کے درمیان تین برسوں کا دور "پاکستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات کا سب سے

کٹھن دور تھا۔ جب اصغر خان نے یہ بات قلمبند کی اس وقت گالبرائتھ (سنہ ۱۹۶۲ء میں نئی دہلی میں مقیم امریکی سفیر) کا جرنل شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد سے امریکہ کی بہت سی سرکاری دستاویزات سامنے آئی ہیں یہ بات واضح ہے کہ امریکہ نے چین ہند تنازعہ کے بعد ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کے لئے ایک بڑا موقع بھانپ لیا تھا یہاں تک کہ گالبرائتھ نے جنھیں صدر کینیڈی تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ نئی دہلی کے امریکی سفارتخانہ میں "نظریاتی جنگ" کا دفتر کھولنے کی اجازت دیدی ہندوستان سے "ایٹمی چھتری" کا وعدہ کیا گیا اور چین کے بعض شہروں پر بمباری کرنے کے لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ منصوبہ بنایا گیا۔ ان منصوبوں پر اس لئے عمل درآمد نہ ہو سکا کہ چینی مقاصد محدود تھے اور امریکی چینی حکمت عملی کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہے۔ کینیڈی جس بات پر بہت برہم ہوئے وہ یہ تھی کہ ایوب خان نے اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا کہ چین کو تنہا کرنے اور غالباً اس پر حملہ کرنے کے امریکی ہند منصوبہ کے ساتھ اشتراک کیا جائے ایوب خان نے اصرار کیا تھا کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ منصفانہ طریق پر حل نہیں ہو جاتا وہ ہندوستان کو ایسی کوئی ضمانت فراہم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں جس کی بنا پر ہندوستان پاکستانی سرحدوں سے اپنی فوجیں ہٹا کر چین کے خلاف اپنی طاقت میں اضافہ کر سکے بس یہ نکتہ تھا جس نے ایوب خان کے عہد میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کا "خاتمہ" کر دیا جب کبھی سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی مکمل تاریخ لکھی جائیگی تو اس حقیقت سے انکار نہ ہو سکے گا کہ سنہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے جارحانہ رویہ کا ایک بڑا سبب پاکستان کی بابت حکومت امریکہ کی برہمی تھی "کشمیر آپریشن" کی توثیق کرنیکی وجہ سے ایوب خان کے ذمہ بہت سی وضاحتیں ہیں لیکن جنگ بندی کی تجویز مان کر انہوں نے ملکی مفاد میں حقیقت پسندی اور حب الوطنی کے گہرے جذبہ کا مظاہرہ کیا تھا، ہر چند کہ انہیں ذاتی طور پر اسکی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

لندن ۱۶ نومبر ۱۹۶۸ء

الطاف گوہر

مترجم:۔ محمد علی صدیقی

ابتدائیہ

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات میں نے انہی دنوں میں قلم بند کر لیئے تھے، اور یہ کتاب انہی تحریروں پر مبنی ہے۔ اِن صفحوں میں نہ اُس جنگ کی تاریخ بیان کی گئی ہے، نہ اُن واقعات و حادثات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو بالآخر جنگ پر منتج ہوئے۔ یہ محض ایک ایسے شخص کے مشاہدات اور تجربات کا تذکرہ ہے جس نے جنگ کے دوران اور اس سے پہلے، پیش آنے والے واقعات میں تھوڑا بہت حصّہ لیا۔

یہ کتاب میں نے جنگ کے اختتام کے بعد جلد ہی، یعنی ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے دوران لکھ ڈالی تھی، لیکن اس کی تکمیل اور طباعت کا معاملہ التوا میں پڑا رہا۔ میں اُس زمانے میں پاکستان کی قومی ایئرلائن کا سربراہ تھا جس کا کاروبار تیزی سے پھیل رہا تھا اور میری پوری توجہ چاہتا تھا۔ میں ۱۹۶۸ء

کے وسط میں میں پی۔آئی۔اے کی خدمت اور دوسری سرکاری ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوا، لیکن فرصت پھر بھی نصیب نہ ہوئی۔ جلد ہی سیاست کے بکھیڑوں میں اُلجھ گیا اور آج تک اُن سے فارغ نہیں ہوا۔ کتاب کو چھپائی کے لیے تیار کرنے کی فرصت مجھے اُس وقت ملی جب ۱۹۷۷ء میں کوٹ لکھپت، ساہیوال اور سہالہ میں مقید یا مری میں زیر حراست رہا۔ اس عرصے میں مسودہ مکمّل کیا اور اُس پر نظر ثانی کی۔ میں ایڈمرل مظفر حسن کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کتاب کے اُس حصّے کے لکھنے میں میری مدد کی جو جنگ میں پاکستانی بحریہ کی خدمات سے متعلق ہے۔ وہ اُس زمانے میں بحری تدبیر و عمل کے معاملات کے سربراہ تھے۔

مَیں نے ابتدائی مسودے کے بیشتر حصّے میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا۔ البتہ بارھواں باب "پیکنگ کا دورہ" بعد میں لکھا گیا، اور بعض ایسی تفصیلیں اور رائیں حذف کر دی گئیں جن کی اشاعت اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ شاید اگلی اشاعت میں شامل کی جا سکیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور مواد بھی ہے جس سے کتاب کی افادیت اور دلچسپی بڑھ سکتی ہے، اور کچھ قابلِ ذکر قصّے بھی ہیں۔ لیکن میں کتاب کی طباعت اور اشاعت میں مزید دیر کرنا نہیں چاہتا، لہٰذا یہ داستان قریب قریب اُسی شکل میں پیش کی جا رہی ہے جیسے جنگ کے بعد ڈیڑھ دو سال میں مرتب کی گئی تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ کچھ اور وقت گزرنے کے بعد جب احساسات کی تلخی کم ہو چکی ہوگی، وہ اشاعت پیش کر دی جائے گی جس میں ایک ایسی جنگ کا زیادہ متوازن نقشہ سامنے آئے گا جو بظاہر بے مقصد لڑی گئی۔

ایبٹ آباد — محمدؐ اصغر خاں

۲۰ مارچ ۱۹۷۸ء — ن

پہلا باب

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کی گرم صبح کو میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے ایک وائکاؤنٹ طیّارے (Viscount) میں کراچی سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہوا۔ اس سے صرف چھ ہفتے قبل میں پاکستانی فضائیہ کی کمان سے سبکدوش ہو کر ایئر لائن کی سربراہی پر تعینات ہوا تھا۔ غیر فوجی مسافر بردار طیاروں میں سفر میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا، کیونکہ اس سے پہلے میں ہوائی سفر عموماً فضائی فوج کے جہازوں میں کیا کرتا تھا، کبھی پائلٹ اور کبھی مسافر کی حیثیت سے۔ اُن طیاروں میں وہ ہنگامہ اور ہلچل دیکھنے میں نہیں آتی جو خصوصاً ہمارے ملک میں عام ہوائی اور ریل کے سفر کا حصّہ ہے۔

اس پرواز میں میرے بازو والی نشست پر کراچی کا ایک خوش حال تاجر سفر کر رہا تھا۔ مجھ سے بات چیت کے دوران اُس نے بین الاقوامی صورتِ حال پر تشویش ظاہر کی اور اُسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ آیا ہمارا ملک ہندوستان کی طرف

سے کسی حملے کا مقابلہ کرسکے گا یا نہیں۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ کیا میرے خیال میں ایسا حملہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ میں نے سوچا کہ فضائی فوج کی سربراہی چھوڑے ہوئے مجھے چند ہی ہفتے ہوئے ہیں، اس لیے جو رائے میں ظاہر کروں گا اسے پوچھنے والا ضرور قابل اعتبار سمجھے گا، اور مجھے چاہیے کہ میں اپنے جواب سے اُس میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ اس کے کچھ قطعی سوال تو میں ٹال گیا، لیکن تھا وہ کھوجی اور تبھی کچھ مطمئن ہوا جب میں نے اُسے یہ یقین دلایا کہ پاکستان بھارتی جارحانہ حملے سے نپٹنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ میری سیدھی سادی اور مخلصانہ گفتگو اس پر اثر کر گئی اور پھر باقی سفر میں اُس نے مجھ سے مزید سوال نہیں کیے۔

جب میں سکون سے بیٹھا تو میرا ذہن ماضی کی طرف پلٹا اور فضائی فوج میں چوتھائی صدی کی خدمت کی یادیں لوٹ آئیں۔ یہ خدمت میرے لیے محض ایک وسیلۂ معاش نہ تھی، ایک وسیع اور گراں قدر تجربہ تھی جس سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اپنی سبکدوشی تک میں ملک کی فضائی فوج کی توسیع و ترقی سے پوری طرح وابستہ رہا تھا۔ اور ۱۹۵۷ء میں اس کی کمان سنبھالنے سے پہلے بھی میں نے مختلف حیثیتوں میں اُس کی ترقی میں حصّہ لیا تھا۔ فضائیہ سے میری جذباتی وابستگی کی تہ میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے دو بھائی، آصف اور خالد، اُس کی خدمت میں جان دے چکے تھے۔ ایک ۱۹۴۸ء میں ایک حادثے میں جاں بحق ہوا، یہ ہماری ایئر فورس کا پہلا حادثہ تھا جس میں کوئی جانی نقصان ہوا۔ دوسرا بھائی دس برس بعد ایک فضائی حادثے میں ختم ہوگیا۔ اِن سانحوں نے میرے دل پر جو داغ چھوڑے ان کی گہرائی کا پورا اندازہ میرے قریبی دوستوں تک کو نہیں۔ ذاتی صدمے سے قطعِ نظر، انھوں نے میرے اور فضائی فوج

کے درمیان ایسا گہرا رشتہ قائم کر دیا ہے جسے وقت کی رفتار نہیں مٹا سکتی۔ یہ اِسی جذباتی تعلق کی کارفرمائی تھی کہ اُس وقت، جب جنگ کا سایہ ملک پر منڈلا رہا تھا، یہ بات مجھے چُبھنے لگی کہ میری حیثیت محض ایک عام سِولین تماشائی سے کچھ مختلف نہیں۔ فضائی فوج میں اپنی خدمت کے دوران اور خصوصاً آٹھ سال کی اُس مدّت میں جب میں اُس کا سربراہ رہا تھا، ہم سب نے مل کر اُسے جس کڑی آزمائش کے لیے تیّار کیا تھا وہ اب سر پر آن پہنچی تھی۔ ہم نے مختلف امکانی صورتوں کے لیے فضائیہ کی تربیت کی تھی اور اسے تیار کیا تھا، اور اب جبکہ اس تربیت اور تیاری کے امتحان کا وقت آ رہا تھا، میری یہ فطری خواہش تھی کہ فضائی ضرب و حرب کے جن نظریات پر میں نے اِس نظام کی تربیت کی بنا ڈالی تھی، ان کے آزمانے کا مجھے موقع ملے۔ یہ تھے وہ خیال جن میں میرا ذہن اُس ہوائی سفر کے دوران محو رہا اور اُن کا سلسلہ سفر کے اختتام پر ہی ٹوٹا۔ راولپنڈی پہنچ کر میں فوراً صدرِ مملکت، ایوّب خاں سے ملا، جن سے ملاقات کا وقت پہلے ہی مقرّر ہو چکا تھا۔

میں نے فضائی فوج کی کمان ۱۹۵۷ء کے وسط میں سنبھالی تھی اور اس کے بعد آٹھ سال تک میرا اور ایوّب خاں کا ساتھ رہا تھا۔ پہلے سال، سوا سال مُسلّح افواج کے ۲ شعبوں کے سربراہوں کی حیثیت سے ہم رفیق کار رہے تھے۔ اس کے بعد ایّوب خاں صدرِ مملکت، مسلّح افواج کے سپہ سالارِ اعظم اور وزیر دفاع ہو گئے اور میرے اور اُن کے منصبی تعلقات کی نوعیت میں لازماً فرق آ گیا۔ ذاتی تعلقات میں گرم جوشی تو کبھی نہ تھی، لیکن مراسم ہمیشہ خاصے خوش گوار رہے۔

ایوّب خاں آدمی بامروّت تھے، ذہین اور ہوشیار تھے، اور شخصیت بھی بارُعب پائی تھی۔ ان کا یہ یقین تھا کہ پاکستان کو اپنی نجات اور ترقی کے لیے اُن کی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ فضائی فوج کے تدبیر و عمل کے معاملات کو زیادہ نہ سمجھتے تھے، ہاں اتنا ضرور جانتے تھے کہ کامیاب برّی لڑائی کے لیے فضا میں صورتِ حال کا موافق ہونا نہایت اہم ہے۔ تاہم اُن سے رابطے کے آٹھ سال کے باوجود میں اُنھیں یہ نہ سمجھا سکا کہ اگر فضائی فوج دشمن کی فضائیہ کو بے اثر نہ بنا سکے تو برّی فوج کی کامیابی عملاً ناممکن ہو جائے گی۔

ایوّب خاں کا فضائی فوج کا تصور بہت محدود تھا، وہ اُسے محض برّی فوج کا ایک بازو سمجھتے تھے، یا دوسرے لفظوں میں ایک ہوائی توپ خانہ جس کا کام یہ تھا کہ وہ پیادہ فوج اور بکتر بند دستوں کی پیش قدمی کے لیے راستہ صاف کرے۔ اس کے برعکس میں نے ہمیشہ اِس بات پر زور دیا تھا کہ آج کل کی جنگ میں فضائی فوج کے منصب کا یہ تصوّر غلط ہے، اور برّی فوج کو فضائیہ کی جو امداد اور تعاون درکار ہوتا ہے وہ اُسی صورت میں بہم پہنچائی جا سکتی ہے جب پہلے دشمن کی فضائی طاقت سے پیدا ہونے والے خطروں کا ازالہ کر لیا جائے۔ میں اس مسئلے میں اُن کو اپنا ہم خیال تو نہ بنا سکا، لیکن وہ معقول آدمی تھے اور انھوں نے اپنی رائے مُجھ پر مسلط کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ میں فضائی فوج کو اپنے نظریے اور طریقے کے موافق منظّم اور تیار کرنے میں لگا رہا اور اُنھوں نے میرے کام میں کوئی مداخلت نہ کی۔ مجھے یقین ہے انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر وہ فضائیہ کی تنظیم کسی اور انداز میں کرنا چاہیں گے تو انھیں اس کے لیے کوئی اور سربراہ مقرر کرنا پڑے گا۔

بحری فوج کے متعلق ایوّب خاں کا تصور اس سے بھی زیادہ محدود تھا۔ وہ شمالی پاکستان کے جاگیردارانہ ماحول میں پلے بڑھے تھے اور ان کے فکر و نظر میں بحری بیڑے اور سمندری ضرب و حرب کا کوئی مقام نہ تھا۔ وہ بحری فوج پر اخراجات کو فضول خرچی سمجھتے تھے اور اس سادہ سی حقیقت کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے کہ پاکستان کی مخصوص جغرافیائی صورت میں بحری فوج کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ملک کے مشرقی اور مغربی بازو ایک دوسرے سے ہزار میل سے بھی زیادہ دور واقع تھے، بیچ میں ایک نامہربان پڑوسی حائل تھا اور ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان رابطے کا قابلِ اعتماد وسیلہ صرف سمندر تھا۔

ملک کی صدارت سنبھالنے کے بعد جلد ہی ایوّب خاں اور بحریہ کے سربراہ، ایڈمرل صدیق چودھری کے درمیان بحری فوج کے معاملات پر اختلافات رونما ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ چودھری صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جگہ افضل الرحمان خاں نے لے لی، جو زیادہ اطاعت شعار ثابت ہوئے۔ اُن کی سربراہی میں بحری فوج نے اپنے روایتی منصب پر قناعت کر لی، جو رسمی فرائض پورا کرنے تک محدود تھا۔

صدرِ مملکت کی حیثیت سے ایوّب خاں نے فضائیہ اور بحریہ کو بری فوج کے اثر میں لانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ مثلاً، اُن کی ایک تجویز یہ تھی کہ بحری اور فضائی کیڈٹوں کو اپنی تربیت کے ابتدائی عرصے میں بحریہ اور فضائیہ کے تربیتی اداروں کے بجائے پاکستان ملٹری اکیڈمی میں رکھا جائے۔ ایک اور تجویز جس کی منظوری کے لیے ایوب خاں نے بڑا زور لگایا، یہ تھی کہ بحری اور فضائی فوجوں کی وردیاں اور اُن

کے رتبوں کے نشان (Badges of rank) بدل کران کی جگہ بّری فوج کی وردیاں اورنشان رائج کردیے جائیں۔ بحری فوج نے تو یہ تجویزیں قبول کرلیں لیکن میں نے اُن کی مخالفت کی۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہ تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں تو فضائی فوج کے عملے کے ذہن اور اوراس کے رویّے پر بھی اُس کا گہرا اثر پڑے گا اور فضائیہ بالآخر برّی فوج کا ایک بازو بن کررہ جائے گی۔ اس تبدیلی کا جو اثر فضائی فوج کی حربی صلاحیت پر لازماً پڑتا اُس کی طرف میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں۔

یہ اوراسی طرح کے بہت سے مسئلے تھے جن سے مجھے فضائیہ کی سربراہی کے دوران نبٹنا پڑا، اوراُس زمانے کی کشمکش کی یادیں ابھی میرے ذہن میں تازہ تھیں۔ تاہم چوتھی ستمبر کی اُس صبح کو جب میں صدرایوب خاں کے دفتر میں داخل ہوا تو میرے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ میں اُس شخص سے گفتگو کرنے جارہا ہوں جس سے دس برس تک میرا واسطہ پہلے ایک رفیقِ کار اور پھر افواج پاکستان کے سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے رہا تھا اور جس سے بارہا میں ملک کے دفاعی مسائل پر بحث کرچکا تھا۔

میں نے اب اس اہم ملاقات میں ایوّب خاں کو مختصراً بتایا کہ میرے خیال میں جنگ ناگزیر ہوچکی ہے، اور کہا کہ فضائی فوج جن منصوبوں کے مطابق اس لڑائی میں حصّہ لے گی وہ میرے ہی تیار کیے ہوئے ہیں، لہٰذا مجھے ایئرفورس کی خدمت میں دوبارہ شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ ایوّب خاں نے میری پیش کش کا شکریہ ادا کیا، لیکن اُن کا خیال تھا کہ کشمیر کی صورتِ حال پر ہندوستان کا ردِّعمل اتنا فیصلہ کن نہ ہوگا، لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے وزیرخارجہ ذوالفقار علی بھٹو

نے انھیں یقین دلایا ہے کہ آزاد کشمیر میں پاکستان کی پیش قدمی کے جواب میں ہندوستان لڑائی کا میدان پاکستان کی سرحدوں تک پھیلانے سے گریز کرے گا۔ حالات کے اس تجزیئے پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے اپنی رائے دہراتے ہوئے عرض کیا کہ چھمب کے علاقے کے گذشتہ چند دن کے واقعات کے پیشِ نظر مجھے یقین ہے کہ ہندوستان جلد ہی جوابی حملہ کرے گا۔ بہرحال جب میں نے اس بات پر اصرار کیا کہ مجھے ایئر فورس میں دوبارہ خدمت کا موقع دیا جائے تو صاحبِ صدر نے پوچھا کہ کیا میں سربراہ کی حیثیت سے فضائیہ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میری پیش کش کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ یہ قسمت کی بات تھی کہ حالات نے جب یہ سنگین صورت اختیار کی اس سے چند ہی دن پہلے میں فضائیہ کی کمان سے سُبکدوش ہوگیا، اور اب میرے جانشین کے ساتھ یہ ناانصافی ہوگی کہ میں ان کی جگہ لے لوں۔ میں نے کہا کہ میں خوشی سے کسی ایسی حیثیت میں خدمت پر آمادہ ہوں جہاں میرا تجربہ کام آسکے۔ اس پر ایوب خاں نے پھر اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ پاکستان کے خلاف ہندوستانی جارحیت کا امکان بہت کم ہے۔ اس ردِّعمل پر مجھے اور تعجب ہوا اور میں دل میں یہ دُعا کرتا ہوا ان کے دفتر سے لوٹا کہ صورتِ حال کے متعلق صاحبِ صدر کی رائے صحیح ثابت ہو۔

ایوانِ صدر سے نکل کر میں فضائی فوج کے نقل و عمل کے مرکز (Operations Room) کی طرف چلا تو مجھے صدارتی کابینہ کا وہ اجلاس یاد آیا جس میں دو برس پہلے ہندوستان کی طرف سے حملے کے خطرے پر بحث ہوئی تھی۔ اس موقع پر افواجِ پاکستان کے خُفیہ خبر رسانی کے محکمے کے سربراہ (Director of Interservices Intelligence)

نے ہندوستان کی جنگی تیّاریوں کا ایک اجمالی جائزہ بڑی وضاحت سے پیش کیا تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ہندوستان کی افواج اس وقت بھی پاکستان کے مقابلے میں تگنی یا چوگنی تھیں، اور ۶۷/۱۹۶۶ تک ہندوستانی صنعت کی بنیادیں اتنی وسیع ہو چکی ہونگی اور افرادی قوّت اور ضروری سامان کے اعتبار سے اُس کے اپنے مُلکی وسائل اتنے وافر ہوں گے کہ وہ پاکستان کے خلاف کوئی بڑی جارنہ مہم شروع کر سکے گا۔ ایوّب خاں نے اس موقع پر پوچھا تھا کہ ہمارے پاس اس مسئلے کا کیا حل ہے، ہمیں اِس خطرے سے نبٹنے کے لیے کیا کرنا چاہیئے؟

اُن دِنوں ہندوستانی افواج کی بڑھتی ہوئی تعداد اور قوّت، پاکستان کے فوجی حلقوں میں تمام ہوشمند لوگوں کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ چین سے مقابلے کی تیّاری کے بہانے ہندوستانیوں نے امریکہ سے بھاری مقدار میں فوجی امداد حاصل کر لی تھی۔ وہ دس لاکھ کی برّی فوج تیّار کر رہے تھے، فضائیہ کی قوّت دگنی کر رہے تھے اور بحری قوّت میں بھی خاصہ اضافہ کر رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی وہ اپنے فوجی ہوائی جہاز اور ٹینک بنانے کے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں بھی مزید اضافہ کر رہے تھے۔ جب میرے بولنے کی باری آئی تو میں نے کہا کہ سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ پاکستان کو ایک بڑی پُرخطر صورتِ حال کا سامنا ہے۔ اگر ہم نے حقیقت سے آنکھیں چُرائیں۔ اور فوراً خطرے سے نبٹنے کی تیاری شروع نہ کی تو نتیجہ تباہ کن ہوگا۔ جلد ہی وہ وقت آجائے گا کہ ہندوستان محض اپنی زبردست جنگی قوّت کی دھونس سے، ضرب وحرب کی زحمت کے بغیر، پاکستان کے خلاف اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر لے گا۔

اس صورت میں پاکستان دُنیا کے نقشے پر تو ضرور برقرار رہے گا، لیکن بین الاقوامی امور میں اُس کی آزادی عملاً ختم ہو چکی ہوگی اور اس کی آواز ہندوستانی آواز کی صدائے بازگشت ہو کر رہ جائے گی۔

صاحبِ صدر میری اس رائے کے اظہار پر کچھ جز بز معلوم ہوئے اور انھوں نے پوچھا کہ پھر ہم ہندوستان سے کیوں کر مقابلہ کر سکتے ہیں اور وہ وسائل کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں جو ہماری دفاعی قوّت کو زیادہ موثر بنانے کے لیے درکار ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ عوام کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ ملک کو کس خطرے کا سامنا ہے۔ اپنے وطن سے ان کی راسخ محبّت کے پیشِ نظر مجھے یہ یقین ہے کہ وہ اس آواز پر لبیک کہیں گے اور کسی ضروری قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں اخراجات گھٹا کر قومی دفاع کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرنا چاہیے۔ میں نے صاحبِ صدر کو اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ پاکستانی فضائیہ کی مشینیں اور سامانِ حرب غنیم کے مقابلے میں کم تر ہیں اور اُس سے کسی معجزے کی اُمید نہ رکھنا چاہیے۔

یہ باتیں سُن کر ایوب خاں پریشان معلوم ہوئے اور بولے: "ایک دن سب کو مرنا ہے، لیکن یہ سوچ کر خودکشی کر لینا انتہائی حماقت ہے۔ عوام اب مزید قربانیوں پر آمادہ نہ ہوں گے۔ ٹیکسوں کا بوجھ پہلے ہی بہت بڑھ چکا ہے اور اس میں مزید اضافہ ہوا تو عوام "بھڑ جائیں گے"۔" جب میں نے بحث آگے بڑھائی تو ایوّب خاں نے کہا کہ ان کو میرے خیالات سے ہمدردی ہے لیکن فضائی فوج کو اُنہی حالات میں گذارہ کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ میں کسی ہمدردی کا محتاج نہ تھا اور میں نے صدر سے کہا کہ اگر کوئی شخص ان حالات

میں واقعی ہمدردی کا مستحق ہے تو وہ خود اُن کی ذات ہے۔ ملک کا دفاع بالآخر اُن کی ذمے داری ہے۔ صورتِ حالات جیسی میری نظر میں ہے۔ اس سے آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض تھا، سو میں نے ادا کر دیا۔

کابینہ کے اس اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ صدر ایوب نے میری ان کھری کھری باتوں پر ناخوشی کا اظہار کیا تھا۔ اپنی رائے پر تنقید، یا اُس کے خلاف مشورہ، برداشت کرنے کا حوصلہ صدر میں نہ تھا اور اُن کی اس کوتاہی کے باعث آگے چل کر ملک کو بڑے سنگین واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔

کابینہ کے اجلاس کا یہ نقشہ ابھی میرے ذہن میں گھوم رہا تھا کہ میں فضائیہ کے دفاعی ہیڈ کوارٹر کے نقل و حمل کے مرکز میں پہنچ گیا۔ وہاں بڑی ہما ہمی دیکھی۔ چند ہی دن پہلے چھمب کے علاقے کے اُوپر ایک فضائی جھڑپ میں پاکستان نے ہندوستان کے چار لڑاکا طیّارے مار گرائے تھے۔ دشمن کی طرف سے جوابی حملہ متوقع تھا اور ہماری فضائیہ اُس سے نبٹنے کے لیے پَر تولے ہوئی تھی۔ ماحول میں کُہرِبائی کیفیت تھی اور میں اُن پرانے رفیقوں میں آکر مسرور تھا جن کے ساتھ میں نے سالہا سال کام کیا تھا۔ اِس طویل رفاقت کے دوران میں ہمارے درمیان جو باہمی اِتفاق اور احترام پیدا ہوا تھا اس کا نقش ابھی تازہ تھا اور میں ذرا ہی دیر میں یہ بھول گیا کہ اب میں فضائیہ کی خدمت سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔

ہم نے گذشتہ چند دنوں کے واقعات پر بات چیت کی اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ یہ آویزش جلد ہی زیادہ سنگین صورت اختیار کر لے گی لیکن اس سلسلے میں کسی کے دل میں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ایئر مارشل نور خاں نے حال ہی میں

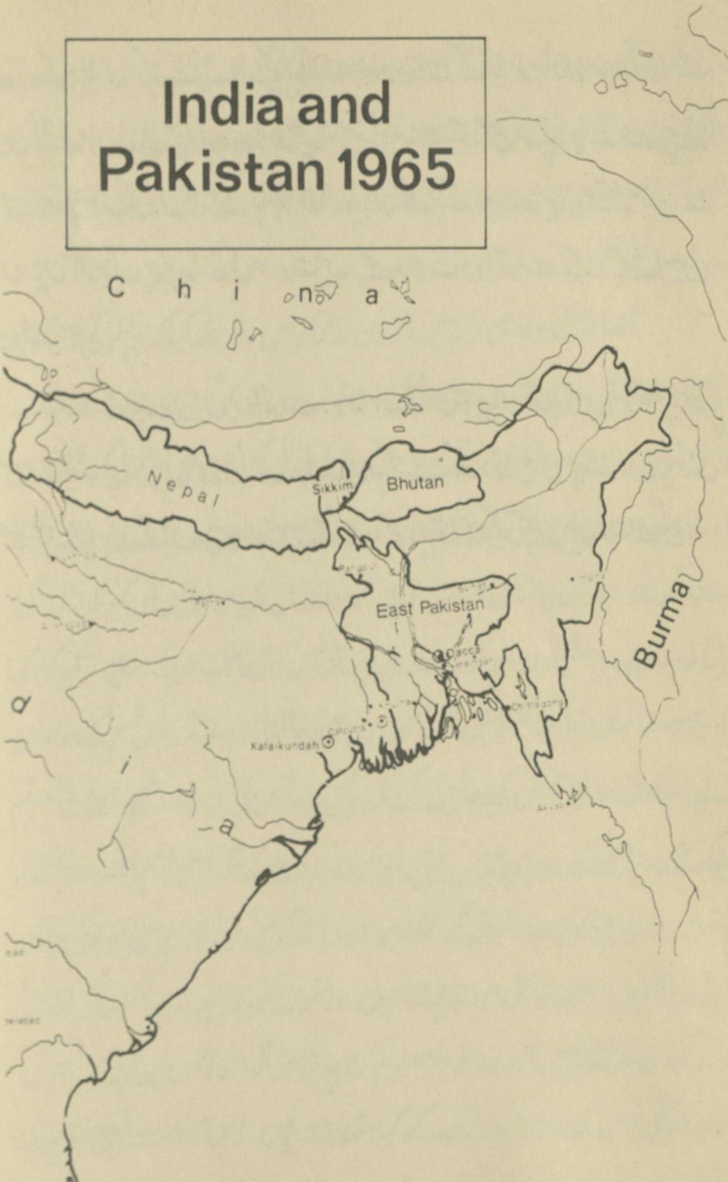
کمان سنبھالی تھی اور وہ اُن بے شمار تفصیلی معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے جو اتنی تیزی سے بدلتی ہوتی صورتِ حال میں اُن کی براہِ راست توجہ چاہتے تھے۔ مجھے یہ سوچ کر بڑا اطمینان ہوا کہ اُن کا عملہ اُس منصوبہ بندی سے پوری طرح واقف تھا جو برسوں سے ایسی صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے کی گئی تھی۔

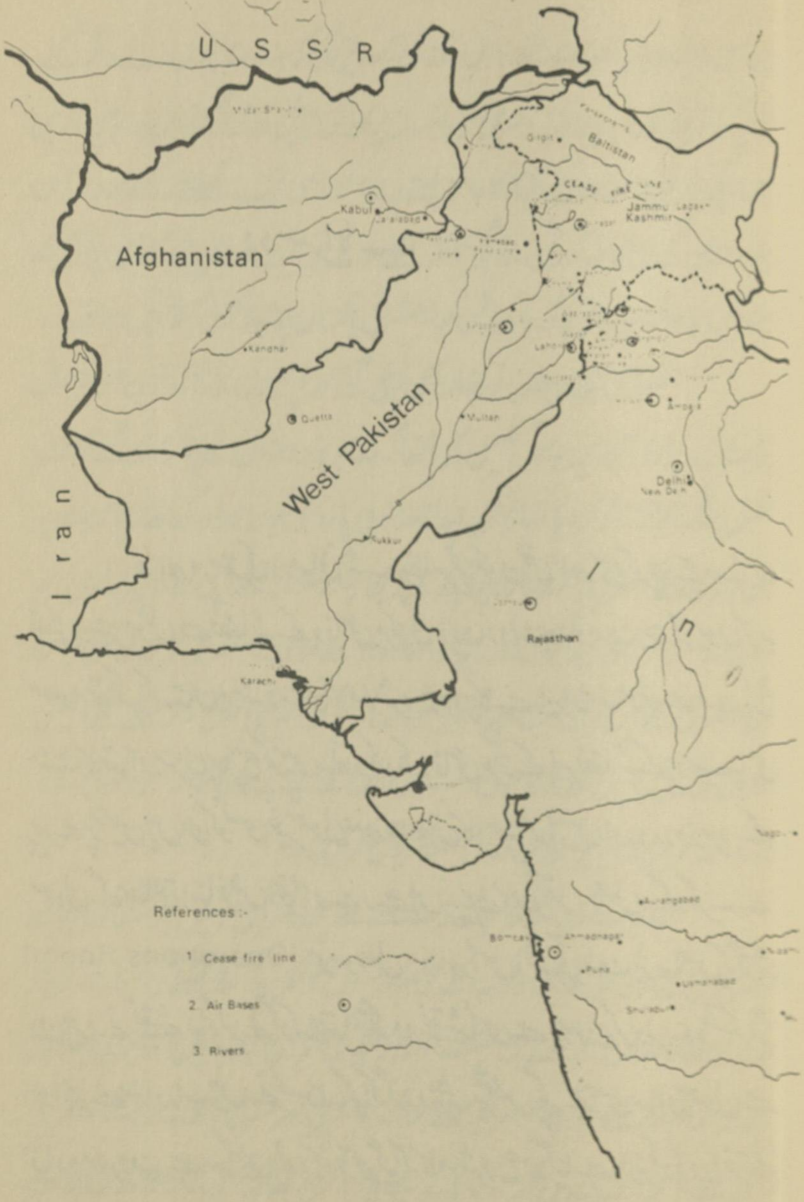
فضائیہ کے دفاعی مرکز میں دو دن گذار کر میں نے طے کیا کہ ۸ ستمبر کی صبح کو میں کراچی لوٹ جاؤں۔ مجھے اِس بات کا اچھی طرح اِحساس تھا کہ اگر ہندوستان سے جنگ چھڑ گئی تو ہماری حربی صلاحیتوں کے بردئے کار آنے میں کیا کیا رکاوٹیں ہوں گی۔ ایک بڑی رکاوٹ جو صاف نظر آرہی تھی یہ تھی کہ ہم اپنی بعض چھوٹی چھوٹی ضرورتوں تک کے لیے امریکہ کے دستِ نگر تھے۔ ہماری یہ محتاجی فضائی فوج کے معاملے میں زیادہ نمایاں تھی کیونکہ اس کی نسبتاً زیادہ پیچیدہ مشینوں اور آلات کے لیے ہم نے اُس وقت تک صرف امریکہ پر تکیہ کر رکھا تھا۔ یہ صورتِ حال نہایت تشویش ناک تھی اور وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس قسم کے سامان کے لیے متبادل ذرائع تلاش کیے جائیں، کیونکہ امریکہ سے اُس کی مزید رسد کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ پنڈی کے دورانِ قیام میں وزارت دفاع کے سکریٹری نذیر احمد سے ملا تھا۔ اور انھوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں جلد ہی ایران اور ترکی جاؤں اور اپنے دوستوں، جنرل خاتمی اور جنرل تانسیل سے ملوں جو بالترتیب اِن ملکوں کی فضائی فوجوں کے سربراہ تھے۔ میں اُن سے مل کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس ضمن میں ہمیں جس قسم کی امداد درکار تھی اس کے حاصل کرنے کے کیا امکانات ہیں۔ اس مسئلے سے قطع نظر میری فوری ضرورت یہ تھی کہ میں حالیہ واقعات کی رفتار سے پوری طرح باخبر رہوں، اور میں نے

فضائیہ کے دفاعی مرکز کے ایک افسر کو کہا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ ہماری سرحدوں کے مکمّل نقشے میرے لیے تیار کر دے، جو میں ۶ ستمبر کو سات بجے صبح کراچی جانے سے پہلے اُس سے وصول کر لوں گا۔ میں چاہتا تھا کہ بیرون ملک کے دورے میں یہ نقشے میرے پاس رہیں تاکہ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں مجھے حالات و واقعات کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

اگلے چند دن میں جو واقعات رونما ہوئے اُن کا بیان تو بعد میں ہوگا، پہلے ہم اس نقشہ پر نظر ڈال لیں جو اُس زمانے میں پاکستان کے دفاع کی چند بنیادی خصوصیتیں ظاہر کرتے ہیں۔ اِن سے ہمیں آئندہ کے واقعات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

India and Pakistan 1965




U S S R
Afghanistan
Kabul
Quetta
West Pakistan
Iran
Multan
Sukkur
Karachi
Gilgit
Baltistan
CEASE FIRE LINE
Jammu
Kashmir
Delhi
New Delhi
Rajasthan
Bombay
Aurangabad
References :-
1 Cease fire line
2. Air Bases
3. Rivers

دوسرا باب

۵ر اور ۶ر ستمبر کی درمیانی شب بہ ظاہر پُرسکون تھی، اور صبح کو چھ بجے جب میں فلیش مینز ہوٹل سے فضائیہ کے دفاعی مرکز کی طرف روانہ ہوا تو صرف چند آدمیوں کو یہ معلوم تھا کہ پاکستان پر ہندوستان کا حملہ شروع ہو چکا ہے۔ میرا راستہ موٹر سے صرف پانچ منٹ کا تھا اور منزل پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دفاعی مرکز کے باہر فضائیہ کے جو سپاہی پہرے پر متعین ہیں ان کو کسی غیر معمولی صورتِ حال کا احساس نہیں اور وہ روزمرہ کے معمول کے مطابق اپنا فرض انجام دے رہے ہیں۔ پہلے میں نقل وحمل کے کمرے (Operations Room) میں داخل ہوا اور اُس افسر کی طرف بڑھا جس کو گذشتہ دن میں نے نقشے تیار کرنے کو کہا تھا، تاکہ وہ نقشے اُس سے وصول کرلوں۔ وہ مُسکراتا ہوا مجھ سے ملا اور اب میں نے محسوس کیا کہ گرد وپیش ہر شخص کچھ بے چین سا اور معمول سے زیادہ مصروف ہے معاً میں خود بخود سمجھ گیا کہ کام شروع ہو گیا ہے۔ ایئر کموڈور اختر نے،

جو اس رات وہاں تعینات تھے، اس بات کی تصدیق کی کہ ہندوستانیوں نے واگہ کے نزدیک سرحد پار کرلی ہے اور دوسری کئی جگہوں پر ان کی پیش قدمی کی خبریں برابر چلی آرہی ہیں۔ کچھ دیر ہم واقعات کی رفتار کا جائزہ لیتے رہے، اور اسی ایک گھنٹے کے دوران ہندوستان کے لڑاکا طیاروں نے گجرانوالہ کے علاقے میں ایک مسافر ریل گاڑی پر حملہ کرکے چند ایک عام شہریوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔ مشرقی پاکستان پر البتہ کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں نور خاں بھی پہنچ گئے اور ہم تینوں نے تازہ ترین صورت حال پر بحث کی۔ ہماری سمجھ میں یہ معمّہ نہیں آرہا تھا کہ بظاہر ہندوستان نے پاکستان کے خلاف مکمل جنگ کا آغاز تو کر دیا تھا لیکن اپنا حملہ مغربی بازو تک کیوں محدود رکھا تھا۔ ہم اس بات پر بھی حیران تھے کہ مغربی پاکستان پر اپنے حملے میں ہندوستان نے اپنی فضائیہ ہماری اہم تنصیبات مثلاً فضائی میدانوں اور ریڈار (Radar) کے خلاف استعمال نہیں کی تھی۔ اس طرح انھوں نے ہمیں ایک ایسا اچھا موقع دیا تھا، جس کی ہم کبھی توقع نہ کر سکتے تھے، یعنی فضائی جنگ میں پہل کرنے کا موقع۔ اب میں اس کے لیے بے چین تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم بلاتاخیر دشمن پر فضائی حملہ شروع کر دیں۔

ظاہر ہے کہ یہ حملہ شام کے دھندلکے سے پہلے شروع نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے منصوبوں کے مطابق ضرب وحرب کے تمام دستوں کو تقریباً آٹھ گھنٹے کی مہلت دینا ضروری تھا۔ اطلاع کے ملتے ہی مختلف کارروائیاں شروع ہو جاتیں اور جلد ہی ہندوستان کے اُن تمام فضائی اڈوں پر بھرپور حملے ہوتے جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے محاذ پر واقع تھے۔ اس حملے کے بروقت آغاز کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ اُس کا فیصلہ دس بجے دن

تک کر لیا جائے۔

اس بحث میں ہم تینوں کے علاوہ چند اور افسر بھی شامل ہو گئے اور ان میں سے کم از کم ایک کی رائے یہ تھی کہ ہمیں خود پہل کرنے کی بجائے دشمن کے حملے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اس تجویز کے حق میں دلیل یہ تھی کہ اگر فضائی جنگ ہماری اپنی سرزمین کے اُوپر ہو تو ہم ریڈار کے نظام سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر حریف کو بھاری نقصان پہنچا سکیں گے۔ یہ منطق نور خاں کو شاید انوکھی معلوم ہوئی ہو، کیونکہ وہ چھ سال پی۔ آئی۔ اے میں رہ کر حال ہی میں ایئر فورس میں واپس آئے تھے اور اپنے نئے عملے کے ساتھ انھوں نے ابھی چند ہی ہفتے گزارے تھے۔ مگر میرے لیئے یہ یہ اندازِ فکر نیا نہ تھا۔ میں آٹھ سال تک فضائیہ کے منصوبوں پر بحثوں میں اُلجھا رہا تھا، اس قسم کی بودی دلیلوں سے خوب واقف تھا اور اپنی سربراہی کے زمانے میں انھیں قطعاً مسترد کر چکا تھا۔ تصور میں ان کی منطق ضرور مفید معلوم ہوتی ہے لیکن اصول حرب کے نقطۂ نظر سے وہ غلط اور ناقابلِ قبول ہے۔ جنگ میں جو حریف محض دفاعی ضرب وحرب پر انحصار کرے وہ کبھی فتح حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ کو اس طرح محدود کر کے وہ خود پہل کرنے کا اختیار دشمن کو سونپ دیتا ہے اور اپنی قوّت کے ایک بڑے حصّے کو، جس سے وہ دشمن پر حملہ کر سکتا تھا، اپنی ہی سرزمین پر پابند کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر دشمن ذہانت سے کام لے تو وہ نسبتاً چھوٹے حملوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر دفاع کرنے والے حریف کو مغالطوں میں ڈال کر اس کی قوّت کو کمزور کر سکتا ہے۔ اور بالآخر اسے شکست دے سکتا ہے۔

اس موقع پر میں نے اپنا یہ نقطۂ نظر پھر واضح کیا، لیکن اب فضائیہ کی کمان میرے ہاتھ میں نہ تھی اور میں اپنا فیصلہ حکماً نافذ نہ کر سکتا تھا۔ بہر حال میں نے جو لائحہ عمل تجویز کیا میری نظر میں صرف وہی ایسا تھا جو ہم بخیر و خوبی اختیار کر سکتے تھے۔ ایئر کموڈور اختر اور ایئر کموڈور رحیم خاں نے میری تجویز کی بھرپور تائید کی اور نور خاں کا بھی خیال تھا کہ یونہی کرنا چاہیئے۔

یہ بحث ختم ہوئی تو میں فوراً ایوان صدر کو چل پڑا تا کہ صدر کو فضائیہ کے منصوبوں سے آگاہ کروں اور ان کے لیے منظوری حاصل کروں۔

آگے کے حالات بیان کرنے سے پہلے اُس تاریخی صبح سے متعلق ایک اور واقعے کا ذکر کرتا چلوں۔ ۶ ستمبر کو علی الصبح جب ہندوستانی فوجیں واگہ کے علاقے میں پاکستان کے علاقے میں داخل ہونا شروع ہوئیں تو ہماری فضائیہ کے وائرلیس آبزرور ونگ (Wireless Observer Wing) کے چوکس مبصروں نے انھیں تاڑ کر فوراً دفاعی مرکز کو اس نقل و حرکت کی اطلاع دی تھی۔ فضائی فوج کے اس گراں قدر بازو نے اس سے پہلے بھی ہمیشہ نہایت خوبی سے اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ اس موقع پر اُس کی مستعدی کا یہ نتیجہ ہوا کہ فضائیہ کے دفاعی مرکز کی جوابی کارروائی اُس وقت شروع ہو گئی جب بری فوج کو دشمن کی کارستانی کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ بھی نہ ہوا تھا فضائی فوج کے دستوں کو ہوشیار اور صدرِ مملکت کو مطلع کر دیا گیا۔ یہ بھی فضائی فوج کی اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت ہے کہ صدر کو ہندوستانی حملے کی پہلی اطلاع فضائیہ ہی کے ایک افسر سے ملی۔ ایئر کموڈور اختر نے، جو ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی شب فضائیہ کے دفاعی

مرکز میں تعینات تھے سب سے پہلے صدر کو ٹیلیفون پر مطلع کیا کہ بھارتی فوجیں پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کے اندر داخل ہو گئی ہیں۔

فضائیہ کی یہ چوکسی برسوں کی تربیت اور تیاری کا حاصل تھی۔ پچھلے چھ برس سے اُس کے ضرب و حرب کے تمام دستے ہر امکانی صورت سے نبٹنے کے لیے پوری طرح مستعد تھے۔ وہ چوبیس گھنٹے تمام آلات سے لیس مکمل تیاری کی حالت میں رہتے تھے۔ ریڈار کے مرکز دن رات کام کرتے تھے اور ضروری عملہ تمام وقت اُن پر تعینات رہتا تھا۔ لڑاکا طیاروں کے پائلٹ اور اُن سے متعلق دوسرے عملے کے افراد ہر وقت اپنے اپنے جہازوں میں چوکس بیٹھے رہتے۔ باہر خواہ کڑاکے کی سردی ہو یا جُھلسا دینے والی گرمی، بارش ہو یا دھوپ، ہماری فضاؤں کے یہ محافظ ایسی حالت میں رہتے کہ کسی حملہ آور کی نقل و حرکت سے چشم زدن میں نبٹ سکیں۔ ہمیں پوری طرح یہ احساس تھا کہ فوجوں کو تنخواہ ہی اس بات کی دی جاتی ہے کہ وہ ملک کی سالمیت کی حفاظت کریں اور اُن کا یہ منصبی فرض ہے کہ ہر امکانی خطرے کا مقابلہ کرنے کو ہر وقت تیار رہیں۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہ تھا کہ کس وقت حملے کا خطرہ ہے اور کس وقت نہیں، ہم تو یہ جانتے تھے کہ ہمارا کام لڑنا ہے اور ہمیں اس وقت بھی اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ جب بظاہر جنگ کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اصولاً یہ بات ہر فوج کے لیے کلیدی اہمیت رکھتی ہے، لیکن میں نے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ اس اصول سے محض زبانی اتفاق کافی نہیں اور اس پر صحیح معنوں میں عمل کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے بڑی لگن اور قیادت کی اعلیٰ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، خصوصاً اُس زمانے میں جب حالات بہ ظاہر پُر سکون ہوں۔ اگر صحیح جذبہ کارفرما نہ ہو تو فوج کی کارکردگی محض

بناوٹ اور دکھاوا ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ غافل رہ کر قومی زندگی میں اپنا مقام اور منصب کھو دیتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ پاکستان کی افواج پر کبھی یہ وقت نہ آئے گا، کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو ہماری سلامتی سخت خطرے میں پڑ جائے گی

یہ ذکر ذرا طویل ہو گیا۔ بات ۶ ستمبر کی صبح کی ہو رہی تھی، جب لڑائی چھڑ جانے کے بعد میں صدر ایوب خاں سے ملنے اُن کے دفتر گیا۔ وہ پریشان معلوم ہو رہے تھے اور یہ ظاہر تھا کہ وہ ہندوستان کے اِس اقدام کے لیے تیار نہ تھے۔ میں نے مختصراً انھیں فضائی فوج کے منصوبے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اُسی شام کے دھندلکے میں بھارت کے فضائی اڈوں پر حملے کا ارادہ ہے۔ انھوں نے اصولاً منصوبے سے اِتفاق کیا لیکن کہا کہ مشرقی پاکستان ابھی تک دشمن کے حملے سے بچا ہوا تھا اِس لیے اُس سے ملحق ہندوستانی علاقوں پر بمباری مناسب نہ ہوگی۔ اُن کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہماری کمزوری کے پیشِ نظر مشرقی محاذ پر لڑائی چھیڑنا ہمارے حق میں مضر ہوگا۔

صدر سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے انھیں یقین دلایا کہ فضائی فوج اپنی ذمہ داریاں نہایت خوبی سے پوری کرنے کی تمام صلاحیت رکھتی ہے اور انھیں اُس کے متعلق کوئی فکر نہ ہونا چاہیے۔ چلتے چلتے میں انھیں یہ بھی بتاتا آیا کہ میرا ارادہ فی الحال راولپنڈی ہی میں ٹھہرنے کا ہے۔

میں جب ایوانِ صدر سے نکل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ امریکی سفیر والٹر میکانگی ایوب خاں سے ملنے آیا ہے۔ میں نے بعد میں سُنا کہ اُس نے صدر کے دفتر میں داخل ہوتے ہی گویا فاتحانہ انداز میں، اِن انتہائی توہین آمیز کلمات سے انھیں

خطاب کیا۔

"اچھا، صاحبِ صدر، اب تو انھوں نے آپ کی گردن پکڑ لی ہے"

سفیر موصوف نے من وعن یہی الفاظ نہ بھی کہے ہوں، اس میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ یہ اندازِ گفتگو جنگ سے قبل اور اس کے دوران پاکستان کی طرف امریکی رویّے کا صحیح آئینہ دار تھا۔

ایوانِ صدر سے جب میں فضائیہ کے دفاعی مرکز کو لوٹا تو دیکھا کہ دشمن کے ٹھکانوں پر شام کو فضائی حملہ کرنے کے سوال پر بحث جاری ہے۔ ایسی صورتوں میں کسی فیصلے پر مکمّل اتفاق ممکن نہیں، خصوصاً جب انسانی جانوں کے ضائع ہونے کا خطرہ درپیش ہو تو پس وپیش اور تامّل کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے۔ اِسی لیے جنگ کی منصوبہ بندی کے لیے بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب حالات پُرامن ہوں اور خطرہ سر پر نہ منڈلا رہا ہو۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ تمام امکانات پر پوری طرح غور کر لیا جائے اور ہر ممکن صورت اور حادثے سے نبٹنے کے لیے تفصیل کے ساتھ منصوبہ تیار کر لیا جائے۔ گذشتہ چند سال میں ہم نے فوج میں اسی قسم کی منصوبہ بندی کی کوشش کی تھی۔ اب جنگ کے آغاز کے وقت صورت یہ تھی کہ نور خاں نے چھ برس تک فضائیہ سے باہر رہنے کے بعد حال ہی میں کمان سنبھالی تھی اور کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ قدرتی طور پر مسئلے کے ہر پہلو کا بغور جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اُن کا یہ تامّل دوسرے لوگوں کو ناگوار ہو سکتا تھا، اور اس سے مجھے بھی اس وقت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی، لیکن اُن کو بڑا نازک فیصلہ درپیش تھا جس کے نتائج نہایت سنگین ہو سکتے تھے، مگر اُن کا تامل قابلِ فہم تھا۔ بہرحال اُدھر وہ اپنے عملے کی مختلف رائیں سن کر اُن

پر غور کر رہے تھے اور ادھر میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اگر فضائی جنگ میں ہم نے پہل نہ کی تو نتائج سنگین ہوں گے۔ یوں یہ بھی ممکن تھا کہ اُسی شام دشمن خود حملہ شروع کر دے لیکن اس کا اندیشہ میری نظر میں زیادہ نہ تھا کیونکہ اگر وہ شام کو کو حملہ کرتے تو اس طرح ہمیں ساری رات سنبھلنے کے لیے مل جاتی۔ اگر ہندوستان فضائی جنگ میں پہل کرنا چاہتا تھا تو اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں گھڑی ۴ ستمبر کی صبح تھی۔ چونکہ جنگ کا آغاز انھوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کیا تھا اس لیے پہلی صبح فضائی حملے سے اُن کا احتراز محض اتفاقی یا بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا، وہ یقیناً دانستہ تھا۔ بااین ہمہ ایسی صورت میں حالات اور خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی اور ہم اُسی شام ہندوستان کے طرف سے پہلے فضائی حملے کے خطرے کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اُوپر میں کہہ آیا ہوں کہ اگر ہمیں اُسی شام حملہ کرنا تھا تو اس کا فیصلہ دس بجے دن تک ہو جانا چاہیے تھا۔ اب اُس گھڑی کو گذرے کئی گھنٹے ہو چکے تھے اور بحث و تکرار ابھی جاری تھی۔ یہ میرے لیے اِنتہائی محرومی اور ناچاری کے لمحے تھے۔

خدا خدا کر کے تین بجے سہ پہر کو یہ فیصلہ ہوا کہ اُسی شب فضائی جنگ کا آغاز ہماری طرف سے ہو اور غروب آفتاب کے چند ہی منٹ بعد ہندوستان کے متعدد ہوائی اڈوں پر بیک وقت حملہ کر دیا جائے۔ شمالی علاقوں میں سال کے اُن دنوں میں سورج چھ بجے ڈوبتا ہے، اور اِس حساب سے ہم عملے کو پرواز کی تیاری کے لیے صرف ڈھائی گھنٹے کا وقت دے سکتے تھے، حالانکہ اِس کے لیے کم از کم آٹھ گھنٹے کا وقت دینا ضروری تھا۔ وقت کی تنگی کے باعث یہ کارروائی اور بھی نازک ہو گئی اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ ہر مرحلے پر تیاری

بے کم و کاست گھڑی کی سوئی کے مطابق انجام پائے۔

ہمارا منصوبہ یوں تھا کہ سرگودھے کے اڈے سے سولہ طیارے مشرقی پنجاب میں آدم پورا ور ہلواڑہ کے لیے روانہ ہوں، جہاں ہندوستان کے دو فضائی اڈے واقع تھے، آٹھ جہاز پشاور سے پٹھان کوٹ کی طرف پرواز کریں، اور آٹھ ماری پور (کراچی) سے جام نگر کا رُخ کریں۔ اِن تمام طیّاروں کی اُڑان کا وقت اِس طرح متعین کیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی لمحے پر ہندوستان کی سرحدوں کے اُوپر پہنچ جائیں۔ اِس طرح اُن کی بیک وقت آمد سے ہندوستانیوں کو ہمارے حملوں کے خلاف تیاری کے لیے کم سے کم مہلت ملتی۔ دوسری طرف اِس منصوبے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے حملہ آور طیّارے اپنے اپنے نشانوں پر بیک وقت نہ پہنچ سکیں گے۔ ان کی آمد کا وقت سرحد اور منزل کے درمیانی فاصلے پر منحصر ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ ہدایت بھی جاری کی جا رہی تھی کہ ہمارے طیّارے نیچی اُڑان کر کے اپنی منزل کے قریب جائیں تاکہ ہندوستانی ریڈار کے پردہ پر اُن کا عکس نہ دیکھا جا سکے۔

ہمارے سرگودھا کے فضائی اڈّے پر جنگی طیّارے سب سے زیادہ تعداد میں جمع تھے۔ اُن کو ابھی تک حملے کے احکام نہیں ملے تھے اور اُس وقت تک وہ لاہور کا دفاع کرنے والی بّری فوج کی فضائی اعانت میں مصروف تھے۔ جو طیّارے اس کارروائی میں استعمال نہیں ہو رہے تھے انھیں حکم تھا کہ دفاعی کارروائی (Defensive alert) کے لیے خبردار رہیں۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بموں اور راکٹوں سے لیس نہیں تھے۔ بعد میں جب انھیں حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تو انھیں ان ہتھیاروں سے لیس کرنا پڑا جو زمین پر حملہ کرنے کے لیے درکار تھے، اور اس کارروائی کے مختلف مراحل اُس تنگ وقت میں

مکمل نہ ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی اُڑان میں تاخیر ہوئی اور اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پٹھان کوٹ پر ہمارے حملے سے ہندوستان کے تمام دفاعی نظام کو پاکستان کی طرف سے مزید فضائی حملوں کا کھٹکا لگ جائے گا اور آدم پور اور ہلواڑے پر ہمارے طیاروں کو زیادہ موثر دفاعی تدبیروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہندوستان کے لڑاکا جہاز اِن ہوائی اڈوں کی حفاظت کے لیے فضا میں منڈلا رہے ہوں گے اور ہمارے حملہ آوروں کو نقصان پہنچنے کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے۔ اس تاخیر کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ہمارے طیارے مقرّرہ وقت سے کچھ دیر بعد اپنے نشانوں پر پہنچ سکیں گے۔ چونکہ حملے کے آغاز کا وقت غروبِ آفتاب کے پانچ منٹ بعد مقرر کیا گیا تھا، اِس لیے اُس میں کسی تاخیر کا مطلب یہ ہو گا کہ حملے کے وقت روشنی تیزی سے گھٹ رہی ہو گی اور اس وجہ سے اُس کا پورا اثر نہ ہو سکے گا۔

ماری پور کے اڈّے پر ہمارے دستے کو اسی قسم کی مشکلوں کا سامنا تھا اور حملے کا فیصلہ کرنے میں جو تاخیر ہوئی اس سے یہاں بھی ضروری کارروائیوں کے اوقات میں وہی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اُڑان کے مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے سرگودھا اور ماری پور کے اڈّوں سے اِطلاع آئی کہ وقت کی پابندی اُن کے لیے ممکن نہیں، اور سرگودھا سے یہ خبر بھی ملی کہ اُس کے تمام طیّارے پرواز پر نہ بھیجے جا سکیں گے کیونکہ اس تنگ وقت میں اُن سب کو اُڑان کے لیے تیّار اور لیس کرنا ناممکن ہے۔ پشاور میں پائلٹ، حملہ کرنے کے فیصلے کی تصدیق کے منتظر رہے اور یہ تصدیق اُن کو اُس وقت پہنچی جب وہ اپنے طیّاروں کے انجن چلا کر روانگی کی اجازت کا انتظار کر رہے تھے۔

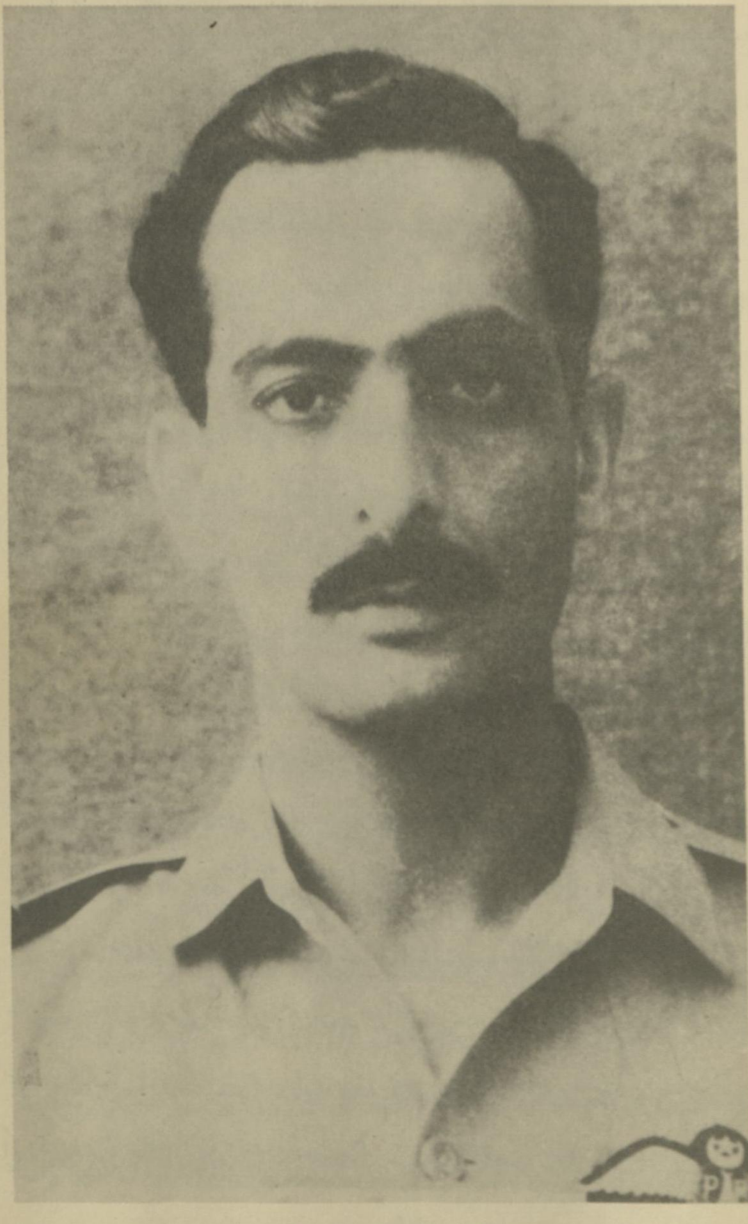
پہلا حملہ پٹھان کوٹ پر اسکواڈرن لیڈر حیدر کی قیادت میں ہوا، اور اگرچہ ذرا تاخیر سے ہوا لیکن کامیاب رہا اور دشمن کو خاصہ نقصان پہنچا سورج ڈوبنے سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے ہندوستانیوں کے ایک بڑے فوجی دستے نے چھمب کے علاقے میں ہماری بری فوج کے مورچوں پر حملہ کیا تھا۔ اس دستے کی اعانت، پہلی دفعہ، مگ ۲۱ (MIG-21) طیاروں نے کی۔ جو بظاہر اُسی روز چندی گڑھ سے پٹھان کوٹ لائے گئے تھے۔ اپنے حملے کے بعد یہ جہاز پٹھان کوٹ پر دوبارہ تیل لے رہے تھے کہ ہمارے طیاروں نے اڈّے پر حملہ کیا۔ آدم پور اور ہلواڑے پر بھی ہمارے حملے ہوئے لیکن بدقسمتی سے ابتدائی فیصلے میں جو تامل اور تاخیر ہوئی تھی اس نے لازماً ان حملوں پر بُرا اثر ڈالا۔

تیسرا باب

پٹھان کوٹ کے اڈّے پر ہمارے حملے سے ہندوستان کو ہمارے ارادوں کا اندازہ ہوگیا تھا، لہٰذا جب ہم نے آدم پور اور ہلواڑے پر حملہ کیا تو ہندوستانی طیّارے مقابلے کے لیے فضا میں مستعد پائے۔ ہمارے حملوں کی قیادت بالترتیب اسکواڈرن لیڈرز عالم اور رفیقی نے کی، جو دونوں بڑے ماہر اور ثابت قدم ہوا باز تھے۔ موسم کی ناسازگاری نے اُن کی مشکلات دوچند کردیں کیونکہ مشرقی پنجاب کے ایک بڑے حصّے پر گرد کے باعث فضا دھندلا گئی تھی۔ امرتسر پر سے گذرنے کے ذرا ہی دیر بعد اُنھیں ہندوستان کے لڑاکا جہاز فضا میں دکھائی دیئے اور معلوم ہوگیا کہ دشمن پر اچانک حملہ کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ عالم نے، جنھیں آدم پور پر حملہ کرنا تھا، دیکھا کہ دشمن کے بہت سے طیّارے ہوائی میدان کو جانے والے راستے پر منڈلا رہے ہیں، لہٰذا اُنھوں نے نہایت مہارت سے اُن سے گریز کرکے اپنا جہاز لوٹا لیا اور سرگودھا واپس آ گئے۔ رفیقی نے دشمن کا دفاع توڑ کر ہلواڑہ پہنچنے کی کوشش

کی اور راستے میں ہندوستان کے لڑاکا جہازوں نے انھیں مقابلے میں اُلجھالیا۔ اِس کے بعد جو لڑائی ہوئی اُس میں اُن کی زیرِ قیادت دستہ (Formation) نے دشمن کے تین ہنٹر (Hunter) جہاز مار گرائے۔ فضا پر اندھیرا چھانے لگا تھا اور راستہ سجھائی نہ دیتا تھا، پھر اس پر دشمن کی مخالفانہ کارروائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفیقی کا دستہ ملواڑہ نہ پہنچ سکا اور اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ لڑتے بھڑتے سرگودھا لوٹ جائیں۔ لیکن وطن کو واپسی کی پرواز میں رفیقی کے طیّارے کی بندوقیں جکڑ کر رہ گئیں۔ پھر بھی اُس نے اپنے دستہ کا ساتھ نہ چھوڑا، اُس کی رہ نمائی کرتا رہا اور دشمن کو اُلجھائے رکھا۔ وہ اِسی طرح نہتّا اپنا طیّارہ بے خطر اُڑاتا رہا اور بالآخر جالندھر کے قریب کہیں گر کر ہلاک ہو گیا۔ اُس کی موت سے پاکستان ایک عظیم لڑاکا ہواباز سے محروم ہو گیا۔ لیکن مرتے مرتے بھی اس نے چھمب کے علاقے پر دشمن کے تین جہاز تباہ کر دیے۔ اس نے جرأت اور فرض شناسی کی جو اعلیٰ مثال قائم کی وہ سرگودھا میں لڑاکا طیّاروں کے دستوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اس نے وہاں کے عملے کے دلوں میں ایک نیا وَلولہ پیدا کیا اور انھوں نے آئندہ چند دنوں میں کئی قابلِ ستائش کارنامے انجام دیے۔

جنوب میں جام نگر پر حملہ خاصہ کامیاب رہا، حالانکہ وہاں بھی ابتدائی فیصلے میں تاخیر کے باعث کچھ گڑبڑ ہوئی۔ ان کوتاہیوں کے باعث ہمارے حملوں کا اثر اتنا نہ ہو سکا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ اِن حملوں سے پہلے ہمارے بمبار دستے کا ایک حصّہ، جو چار بی۔ ۵۷ (B - 57) جہازوں پر مشتمل تھا، پشاور منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے ماری پور پر ہمارے بمبار بازو کی قوّت کم ہو گئی تھی۔ ۷ ستمبر کو جب راولپنڈی میں فضائی فوج کے



اسکواڈرن لیڈر رفیقی

دفاعی مرکز میں حملہ کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر بحث ہو رہی تھی، ماری پور کو یہ ہدایت موصول ہوئی کہ اڈے پر جتنے بی۔ ۵۷ بمبار طیّارے موجود ہوں وہ سب فوراً پشاور روانہ کر دیئے جائیں۔ غالباً ہوا یہ کہ پنڈی میں اُس بحث کی افراتفری میں کسی نے یہ فیصلہ کر ڈالا کہ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ جتنے بی۔ ۵۷ بمبار مل سکیں وہ سب پشاور بھیج دیئے جائیں۔ بہر حال، نتیجہ یہ ہوا کہ جب ساڑھے چار بجے سہ پہر ماری پور کو یہ احکام موصول ہوئے کہ اُسی شام بی۔ ۵۷ بمباروں کو جام نگر پر حملہ کرنا ہے، تو اس سے متعلقہ حکام کو کچھ پریشانی ہوئی۔ وہاں اُس وقت جتنے جہاز موجود تھے اُن میں سے اکثر پشاور روانہ ہونے کے لیے رن وے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ سب فوراً روک کر واپس بُلائے گئے اور پائلٹوں کو مطلع کیا گیا کہ انھیں کس مہم پر جانا ہے۔ جھٹپٹا ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں رہی تھی لہٰذا جلدی جلدی جہازوں کو تیار کیا گیا۔ جس طرح سرگودھا میں ہوا تھا اُسی طرح یہاں بھی جتنے طیّارے اس تنگ وقت میں تیار کیے جا سکتے تھے تیار ہوئے۔ یہ چھ بی۔ ۵۷ بمباروں کا ایک دستہ تھا۔ جو مقررہ وقت کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ یہ جہاز جب جام نگر کے اوپر پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا جس کے باعث راستہ مشکل سے دکھائی دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دِقّت یہ بھی تھی کہ اُس علاقے پر نیچے نیچے بادلوں کے ٹکڑوں کی ایک تہہ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر بھی ہمارے ہوا باز جام نگر کی نشان دہی کرنے اور اس پر بمباری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نمبر ۳۱ کے بمبار بازو نے اپنے حملے رات بھر جاری رکھے۔ بعد میں اس کے طیّاروں نے ایک اور اہم خدمت انجام دی، انھوں نے زمین پر دشمن کے زبردست دفاعی انتظام

کے باوجود راتوں کو اس کے لڑاکا طیّاروں کے ہوائی اڈوں پر حملے کیئے۔

بہ حیثیت مجموعی جنگ کے پہلے دن کی کارروائیوں کا نتیجہ حوصلہ افزا رہا اور اس سے ہماری ہمتیں بڑھ گئیں۔ ہم حملہ میں پہل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ہم نے ہندوستان کی فضائیہ کو خاصہ نقصان پہنچایا تھا۔ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ شام کی ان کارروائیوں کے بعد رات کو ہمارے بمبار دشمن کے ٹھکانوں پر حملے کریں گے۔ چنانچہ بی۔ ۵۷ طیاروں نے پشاور اور ماری پور سے اُڑ کر رات کی تاریکی میں آدم پور، ہلواڑا ، پٹھان کوٹ اور جام نگر پر حملے کیئے۔ اس کے بعد پچھلے پہر ہندوستان کے چند منتخب فضائی میدانوں کے قریب چھاتہ بردار دستے اُتار دیئے گئے۔ ۷ ستمبر کی صبح جب طلوع ہوئی تو ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دشمن کی فضائیہ کو اچھّی مار پڑی ہے۔ اگلے دن اُس کے ردِعمل سے ظاہر ہوا کہ ہماری کامیاب کارروائیوں نے اُسے ہلا کر رکھ دیا ہے۔

۷ ستمبر کے دن پاکستان کی فضائیہ بہت مصروف رہی۔ دوپہر کے قریب ہمیں ڈھاکے سے خبر ملی کہ ہمارے لڑاکا طیّاروں نے صوبۂ بہار میں کلائی کنڈہ پر جہاں ہندوستانی فضائیہ کا ایک اڈّا واقع تھا، حملہ کر دیا اور دشمن کو خاصہ نقصان پہنچایا۔ اندازہ یہ تھا کہ چودہ کینبرا بمبار زمین ہی پر تباہ ہو گئے اور چھ کینبرا طیّاروں اور چار ہنٹروں کو نقصان پہنچا۔ اس تمام کارروائی میں ہمیں صرف ایک جہاز کا نقصان ہوا جو فضا میں تباہ ہو گیا۔

اس حملے کی خبر سُن کر پہلے ہمیں تعجب ہوا، کیونکہ گروپ کیپٹن حیدر کو، جو مشرقی پاکستان میں فضائیہ کے سربراہ تھے۔ اس حملے کے لیے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈی میں فضائیہ کے دفاعی مرکز میں جو ہلچل مچی ہوئی تھی اُس میں

لوگ یہ بھول گئے تھے کہ حیدر کو بہت عرصہ پہلے یہ مستقل حکم مل چکا تھا کہ اگر انھیں کسی وقت یہ پکّی خبر ملے کہ مغربی محاذ پر لڑائی چھڑ گئی ہے تو وہ کسی مزید حکم کا انتظار کیے بغیر جنگ کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیں اور پہلے سے طے شدہ ہندوستانی ٹھکانوں پر حملہ کر دیں۔

یہ واضح حکم بہت پہلے، میری سربراہی کے زمانے میں، میری ہدایت پر، اس خطرے کے پیشِ نظر جاری کیا گیا تھا کہ اگر جنگ یکایک چھڑ گئی تو شاید مشرقی پاکستان سے ہمارے مواصلات کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور ممکن ہے کہ ہندوستان ہمارے ریڈیو کی نشریات بھی مشرق تک نہ پہنچنے دے۔ فی الحقیقت اس موقع پر ایسا نہیں ہوا، لیکن حیدر نے جب صدرِ پاکستان کی وہ نشری تقریر سُنی جس میں جنگ کی خبر قوم کو دی گئی تھی تو انھوں نے بجا طور پر مزید کسی تصدیق کا انتظار کیے بغیر منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اس کے بعد جنگ کے تمام عرصے میں انھوں نے اپنے طرزِ عمل میں اسی مستعدی کا مظاہرہ کیا اور اُن کی سرکردگی میں پاکستانی فضائیہ نے مشرق میں تنہا بڑی مہارت اور پامردی سے لڑائی لڑی۔

اُدھر آسمانوں میں ہماری ایئر فورس فضا پر قابو حاصل کرنے کے لیے اپنے معرکوں میں اُلجھی ہوئی تھی، اور ادھر زمین پر برّی فوج ہندوستان کے اچانک حملے کے ابتدائی اثرات سے سنبھل کر دشمن کی کارروائیوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ یہاں پہل ہندوستانیوں نے کی تھی اور انھیں پیش قدمی حاصل تھی۔ ۷ستمبر یعنی جنگ کے دوسرے دن تک یہ بات صاف نہیں ہوئی تھی کہ لاہور پر اُن کا دھاوا اُن کے منصوبوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے یا محض اپنے حریف کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش ہے، جس کے پردے میں کسی اور علاقے میں بھرپور حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہندوستان کی

بکتر بند فوج کے متعلق صحیح معلومات ضروری تھیں، لیکن ہمارے جنرل ہیڈ کوارٹرز کو یہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہ تھا کہ دشمن کے بکتر بند دستے کہاں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں یا کس سمت میں حرکت کر رہے ہیں۔ خفیہ خبر رسانی کے ذریعے کچھ اطلاعات البتّہ آئی تھیں ان سے، اور فضائی معائنے کی رپورٹوں سے، یہ اندازہ لگایا گیا کہ دشمن کے بکتر بند دستے جالندھر سے مغرب کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ اس اندازے کے مطابق ہماری فضائیہ کو حکم دیا گیا کہ دریائے بیاس کے پُل پر بمباری کرے تاکہ دشمن کی بکتر بند فوج کا اجتماع منتشر کیا جا سکے۔ فضائیہ کے نقطۂ نظر سے پُلوں کو بمباری کا نشانہ بنانا چنداں مفید نہیں، جب تک کہ حملہ اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہو کہ اس کا بھرپور اثر بھی ہو سکے۔ تاہم اُس وقت کی صورتِ حال میں، دشمن کی بکتر بند فوج کی اہمیت کے پیشِ نظر فضائیہ نے بیاس کے پُل پر بمباری کے لیے چند پروازیں کیں۔ تیر نشانے پر نہ بیٹھا اور پُل سلامت رہا، لیکن کچھ بم نشانے کے بہت قریب گرے تھے اور ان سے پُل کو تھوڑا بہت نقصان ضرور ہوا۔

۷ ستمبر کی شام کو جنرل ہیڈ کوارٹرز کے نقل و حمل کے مرکز میں اکثریت کا اندازہ یہ تھا کہ ہندوستان کی بکتر بند فوج امرتسر کے عقب میں جمع ہو رہی ہے تاکہ اسے لاہور پر پیش قدمی کی پُشت پناہی کے لیے کام میں لایا جا سکے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم اپنی بکتر بند قوّت اُس بڑے جوابی حملے میں لگا دیں جو لاہور کے جنوب اور مشرق میں، کھیم کرن کے علاقے میں کیا جانے والا تھا۔ اِس فیصلے کے بارے میں متعلقہ افسروں کے درمیان جو بحث ہوئی میں اس میں شریک نہ تھا لیکن میرے خیال میں مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے بکتر بند دستوں کو مجتمع ہونے کے لیے زیادہ مہلت نہ مل سکے۔ منصوبے کے مطابق حملے کی

قیادت بکتر بند ڈِویژن نمبر اکو کرنی تھی اور اسے سہارا دینے کے لیے ڈِویژن ۱۱ کے پیادہ بریگیڈ کا اِنتخاب کیا گیا تھا۔ اُس علاقے میں دشمن کے دفاعی مورچے زیادہ مضبوط نہ تھے اور یہ اُمید کی جا رہی تھی کہ ہمارا حملہ انھیں توڑنے میں کامیاب ہو جائے گا اور ہریکے روڈ کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا آگے بڑھے گا۔ اِس طرح امرتسر اُس کی زد میں آ جائے گا اور اگر ممکن ہوا تو ہماری فوج باہر ہی سے گذر کر لاہور کے محاذ کے مقابل دشمن کے مورچوں کے آگے تک پھیل جائے گی۔

اس منصوبے کے تصوّر میں جسارت تو ضرور تھی لیکن تین بڑے نقص بھی تھے۔ ایک تو یہ کہ ہماری کمان کے پاس ہندوستانیوں کے مقاصد اور ارادوں کا کوئی واضح نقشہ نہ تھا۔ پھر یہ بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اُن کی بکتر بند فوج کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں۔ پہلے سے دشمن کے اگلے اقدام کا صحیح اندازہ کیئے بغیر اپنی بکتر بند فوج کو اتنے بڑے حملے میں اُلجھا دینا نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ہماری پیادہ فوج کا وہ ڈِویژن جس کو بکتر بند ڈویژن کی اعانت کے لیے چُنا گیا تھا، اسے چند ہی دن قبل اُس مورچے سے ہٹا کر چھمب کے علاقے میں کُمک کے طور پر بھیج دیا گیا۔ اِس طرح ہماری فوج کا حملہ کرنے والا مرکزی حصّہ بُری طرح کمزور ہو گیا۔ ہماری اعلیٰ کمان کا رازداری پر اتنا زور تھا کہ جوابی حملہ کی فوج کے بڑے بڑے افسروں کو بھی آخر وقت تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ انھیں کیا خدمت انجام دینی ہے اور اُن کی منزلِ مقصود کیا ہوگی۔ نہ انھیں ٹھیک ٹھیک یہ بتایا گیا تھا کہ انھیں کِس علاقے میں کارروائی کرنی ہوگی۔ میدانِ جنگ کے تفصیلی نقشے، جو بڑی لڑائی میں نہایت اہم ہوتے ہیں، کمانڈروں کو حملہ شروع ہونے کے چوبیس گھنٹے بعد ملے یہ رکاوٹیں

بجائے خود سنگین تھیں، پھر قیادت بھی گھٹیا۔ چنانچہ مہم شروع ہونے سے پہلے ہی ناکامی اُس کا مقدر بن چکی تھی،' اور دوسرے ہی دن یہ واضح ہو گیا کہ بکتر بند دستے کا حملہ ناکام ہو گیا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ اطلاعات کہ ہندوستان کے بیشتر بکتر بند دستے جموں کے علاقے میں سیالکوٹ کے محاذ پر مجتمع ہو رہے ہیں۔

۸ ستمبر کی شام تک یہ واضح ہونے لگا کہ اُس علاقے میں ہندوستان کی فوجیں بھاری تعداد میں جمع ہو گئی تھیں۔ اندیشہ یہ تھا دشمن وہاں یوں حملہ کرے گا کہ سیالکوٹ سے لڑ کر شمال اور عقب سے لاہور کے دفاعی مورچوں کو خطرے میں ڈال دے۔ ۱۱ ستمبر کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمارے بکتر بند دستوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ کھیم کرن کے محاذ سے نکال کر سیالکوٹ کے علاقے میں منتقل کر دیا جائے تاکہ وہاں ہندوستان کی طرف سے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ ۱۲ تاریخ کو یہ احکام جاری کیے گئے کہ نمبر ۱ بکتر بند ڈویژن کے دو بریگیڈ کھیم کرن سے وزیر آباد بھیج دیئے جائیں۔ اور اس کے لیے ریل اور موٹر گاڑیوں دونوں کو کام میں لایا جائے۔ یہ بہت بڑا کام تھا اور چونکہ فوری کارروائی ضروری تھی اس لیے دن کے اُجالے میں فیصلے پر عمل درآمد کرنا پڑا۔ یہ اندیشہ تو تھا ہی کہ اس سفر میں دشمن ہمارے بکتر بند دستوں پر ہوا سے بمباری کرے گا، لیکن اس سے مفر نہ تھا۔ بہر حال ۱۳ اور ۱۴ کی درمیانی شب ہمارے دستوں نے کوچ کرنا شروع کیا اور ۱۵ کو پچھلے پہر یہ پُر خطر کارروائی مکمل ہوئی۔ اس تمام سفر کے دوران میں ہماری فضائیہ کے جہاز چوکس رہے اور اس کے لیے پوری طرح تیار تھے کہ اگر ضرورت پڑے تو بکتر بند دستوں کی حفاظت کے لیے بڑے پیمانے پر فضا میں دشمن سے جنگ کریں۔ خوش قسمتی سے ہندوستان کی طرف سے کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ غالباً انھیں

سفر کی خبر ہی نہ مل سکی۔

اِس اثنا میں فضائی جنگ میں بحیثیت مجموعی ہمارا پلّہ بھاری رہا تھا۔ ہندوستانیوں نے بہت مار کھائی تھی اور اُن پر تھکن کے آثار ظاہر تھے۔ پہلے دو دن تو وہ خاصے جم کر لڑے تھے لیکن اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ مقابلے سے کترا رہے ہیں۔

۷ ستمبر کو فضا میں دشمن نے سب سے زیادہ سخت حملے سرگودھا پر کیے تھے۔ کُل چار حملوں میں اُس نے ۱۹ طیّارے استعمال کیے، جن میں سے دس ہم نے مار گرائے اور تین کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا صرف ایک ایف ۸۶ جہاز زمین پر تباہ ہوا اور ایک ایف ۱۰۴ ہوا میں اس ہندوستانی مسٹیر طیّارہ (Mystere Fighter) کے ملبے میں اُلجھ کر برباد ہوگیا جسے خود اُس نے مار گرایا تھا۔ لیکن اُس کا پائلٹ بچ کر اُتر آیا۔

فضائیہ کی ابتدائی کارکردگی یقیناً بہت اچھی تھی، لیکن اسے حد سے زیادہ کام کرنا پڑا تھا۔ ایک ایک پائلٹ نے چار چار یا پانچ پانچ حملے کیے تھے اور اُن میں سے بعض تو متواتر دو دو راتوں کو بالکل سو نہ سکے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ہندوستان کی فضائیہ پر اُس نقصان کا کیا اثر پڑتا ہے جو اُس نے اُٹھایا تھا، اور یہ کہ وہ ہم پر وہ دباؤ جاری رکھ سکتی ہے یا نہیں جو اُس نے پچھلے ۴۸ گھنٹوں میں ڈالا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اِسی امر پر مقابلے کے آخری نتیجے کا دارومدار ہوگا۔

اس سوال کا جواب ہمیں ۸ ستمبر کو مِل گیا۔ اُس دن پو پھٹنے سے لے کر جھٹپٹے کے وقت تک ہندوستانیوں نے توپ خانے کے مقامات پر صرف چھ حملے کیے۔ اُجالے میں کسی فضائی میدان پر حملہ نہیں ہوا، لیکن ۸ اور ۹ ستمبر کی درمیانی رات کو پانچ کینبرا بمباروں

نے پاکستان کے علاقے پر کارروائیاں کیں، تاہم وہ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ اِس سے اِس بات کی تصدیق ہوگئی کہ دشمن کی فضائیہ کو منہ توڑ جواب مِل گیا تھا۔ اُس وقت تک ہم نے زمین پر ہندوستان کے ۲۸ طیّارے برباد کیے تھے اور ۱۴ کو نقصان پہنچایا تھا۔ اِن میں زیادہ تر کامیابیاں پہلے ہی حملے میں حاصل ہوئی تھیں۔ فضا میں ہم نے ۳۱ جہاز مار گرائے تھے اور چھ کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان کے علاوہ ایک نیٹ (Gnat) کو پاکستان کے ایک فضائی میدان پر اُترنے پر مجبور کیا تھا۔ اِس حساب سے فضائی لڑائی کے پہلے آٹھ دنوں میں ہندوستان کے ۶۰ طیّارے تباہ ہوئے تھے اور ۲۰ کو نقصان پہنچا تھا۔ ہمارے اپنے کُل ۱۲ طیّارے تباہ ہوئے، جن میں وہ بھی شامل تھے جو فضائی حادثوں کے شکار ہوئے۔

جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے، صدر ایوّب خاں کے دفاعی منصوبوں میں بحریہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لہٰذا بحریہ کی کمان نے خود ہی اپنے جنگی منصوبے تیار کیے تھے اور جب جنگ چھڑی تو انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق بحری لڑائی لڑی۔ جنگ سے پہلے کشمیر میں جو واقعات رونما ہوئے تھے اُن پر بحریہ کی اعلیٰ کمان نے پوری طرح نظر رکھی تھی اور خود اپنے جنگی منصوبوں کے مطابق جہازوں کو سمندر میں رکھا تھا۔

۶ اور ۷ ستمبر کو بحرِ عرب میں اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر ہماری بحریہ کے وہ دستے جو خاص طور پر اس کام کے لیے منظم کیے گئے تھے۔ دشمن سے ان کی مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی بحریہ ہمارے آبدوز جہاز "غازی" سے بُری طرح خائف تھی اور اُس کے ڈر سے دشمن کے جہازوں نے اپنی بندرگاہوں کی پناہ میں رہنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔ ہماری بحریہ دشمن سے زور آزمائی کرنے کے لیے بے چین تھی لیکن ہندوستان کی

احتیاط نے اُسے اِس موقع سے محروم کر دیا۔ بہر حال، اِس احساسِ محرومی کی تلافی مشرق میں ایڈمرل سیّد محمّد احسن کی کارروائی سے ہو گئی۔ ایڈمرل احسن اُس زمانے میں مشرقی پاکستان میں ان لینڈ واٹر ٹرانسپورٹ اتھارٹی (Inland Water Transport Authority) کے سربراہ تھے۔ انھوں نے برق رفتاری سے ہندوستان کی ساحلی جہاز رانی کے ایک سو سے زائد جہازوں کو اُن کے قیمتی مال کے ساتھ پکڑ لیا۔ اُس وقت ہماری بحریہ کا کوئی بیڑا مشرقی پاکستان میں موجود نہ تھا، اس لیے ایڈمرل احسن کی یہ کارروائی غیر معمولی تحسین کی مستحق ہے۔

۶ ستمبر کو ہماری بحریہ نے فیصلہ کیا کہ دشمن پر اُس کے اپنے ساکن سمندری علاقے پر حملہ کرے۔ چنانچہ ایک منصوبہ نہایت احتیاط سے تیار کیا گیا جس میں بے کم و کاست تمام جزئیات کا تعین کر لیا گیا، اور پھر ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی رات کو اسی منصوبے کے مطابق ہماری بحریہ نے رن کچھ کے نزدیک "دوارکا" پر نہایت جرأت مندی سے بمباری کی۔ اِس سے دشمن کے حوصلے جتنے پست ہوئے اُسی مناسبت سے ہماری بحریہ کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اِس حملے کا اِتنا زبردست اثر ہوا کہ جنگ کے باقی عرصے میں ہندوستانی بحریہ کو ہمارے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ ہمارے اُن تجارتی جہازوں سے نہ اُلجھ سکے جو ضروری تیل، گولہ بارود اور فوجی سامان لے کر کراچی یا چاٹگام آ رہے تھے۔ بحرِ عرب کے ساحلی علاقوں پر قابو حاصل کرنے کے بعد ہماری بحریہ کی کمان یہ چاہتی تھی کہ کھُلے سمندر میں اُن تجارتی جہازوں کو روکے جو مال لے کر ہندوستان جا رہے تھے، لیکن ہماری وزارتِ خارجہ نے بین الاقوامی رائے عامہ کے خوف سے یہ کارروائی نہ ہونے دی۔

چوتھا باب

لڑائی کے پہلے دو دن میں فضائیہ کی کارکردگی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے راولپنڈی سے روانہ ہو کر ان دوست ممالک کا دورہ شروع کر دینا چاہیئے جہاں سے ہمیں وہ ساز و سامان اور آلات مل سکتے تھے جن کی ہمیں فوری ضرورت تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ پہلے چین اور انڈونیشیا جاؤں اور اس کے بعد ترکی اور ایران۔ ایوب خاں نے میری تجویز سے اِتّفاق کیا اور میں نے جنرل ہیڈ کوارٹرز اور ائر ہیڈ کوارٹرز سے اُن کی ضروریات کے متعلق پوری معلومات حاصل کیں۔ فوج کو فوری طور پر سب سے زیادہ ضرورت گولے بارود اور دھماکے سے پھٹنے والے مادّے کی تھی۔ لیکن ساز و سامان اور گولے بارود سے بھی زیادہ اُن کی ضرورت یہ تھی کہ چین اپنی فوجیں "نیفا" (N.E.F.A.) اور لدّاخ کے علاقوں کی طرف بڑھا لائے تاکہ مغربی محاذ پر ہندوستانی فوجوں کا دباؤ کچھ کم ہو۔

فضائی فوج کی صورت یہ تھی کہ اُس کے پاس فاضل طیّارے بالکل نہ تھے، نہ پہلے کبھی رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا ایک طیارہ بھی ضائع ہوتا تھا تو اس نقصان کی کوئی تلافی نہ ہوسکتی تھی۔ اور ظاہر تھا کہ اگر ہمارے چند طیّارے روز گرتے رہے تو بہت جلد ہماری فضائی فوج کی قوّت عملاً ختم ہوجائے گی۔ اور وہ کوئی قابلِ ذکر جنگی خدمت انجام دینے کے قابل نہ رہے گی۔ ہندوستانیوں کے پاس ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ طیّارے موجود تھے اور وہ بجا طور پر یہ توقع کرسکتے تھے کہ دو تین ماہ کے اندر ہماری فضائیہ کی قوّتِ حرب وضرب ختم ہوجائے گی، اور اگر اس عرصے میں اُن کی فضائی فوج کو سخت چوٹیں بھی کھانی پڑیں، تب بھی اُن کا پلّہ بھاری رہے گا۔ ہمارے مقابلے میں اُن کو ایک اور فوقیت یہ بھی حاصل تھی اُن کے ملک کا رقبہ بہت زیادہ وسیع تھا اور وقت پڑنے پر وہ اپنی فضائیہ کے ایک حصّے کو ایسے دور دراز ٹھکانوں پر منتقل کرسکتے تھے۔ جو ہمارے طیاروں کی زد سے پرے ہوں۔ اِس طرح وہ اپنی فضائی طاقت کو ایک لمبے عرصے تک برقرار رکھ سکتے تھے۔ پاکستانی فضائیہ کو فوری ضرورت لڑاکا طیّاروں کی تھی، نیز ہتھیاروں، آلات، گولے بارود اور فاضل پرزوں کے اُس وسیع اور پیچیدہ سلسلے کی جو فضائی ضرب وحرب کے لیے درکار رہتا ہے۔ ہمارے دوستوں میں صرف چین ہمیں یہ ساز وسامان خاصی مقدار میں فراہم کرسکتا تھا، اور یہ بھی توقع تھی کہ شاید انڈونیشیا ہماری مدد پر آمادہ ہو۔ چنانچہ وزیر اعظم چو این لائی اور صدر سوکارنو کے نام ایوّب خاں کے ذاتی پیغام لے کر میں ۹ ستمبر کو کراچی چلا گیا، اور پھر اُسی دن وہاں سے پی۔ آئی۔ اے کے ایک بوئنگ میں پیکنگ کے لیے روانہ ہوا۔

کشمیر اور چینی ترکستان کے اُوپر پرواز کرتے ہوئے ہم براہِ راست پیکنگ پہنچ گئے۔ اِس سفر میں قریب قریب سات گھنٹے صرف ہوئے اور ۱۰ ستمبر کی صبح کو تین بجے ہم پیکنگ پر اُترے۔ بعد میں اُسی دن میں چو این لائی سے ملا۔ انھوں نے جنگ کی صورتِ حال سے بڑی دلچسپی ظاہر کی اور اُن کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اُس کے متعلق انھیں پہلے سے بہت کچھ معلوم تھا۔ اُنھوں نے فضائیہ کی کارکردگی پر مجھے مبارک باد دی لیکن برّی لڑائی کی صورتِ حال پر کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ پاکستانی فوج بہ ظاہر دفاعی لڑائی لڑ رہی ہے۔ اور یہ رائے دی کہ تعداد میں اپنی کمتری کے پیشِ نظر ہمیں جارحانہ کارروائی کرنی چاہیے اور نقل و حرکت اور اچانک حملے کی صلاحیت کے ذریعے دشمن کو دفاعی لڑائی پر مجبور کرنا چاہیے۔ یہ اصولِ حرب کا ایک ابتدائی نکتہ ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اہم موقعوں پر بسا اوقات بعض ایسے ابتدائی تقاضے بھی نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔

چو این لائی نے خاصی تفصیل سے بات چیت کی اور پھر ہمارے سفیر جنرل رضا کو اور مجھے دِن کے کھانے پر روک لیا۔ میں نے ایوّب خاں کا خط انھیں دیا اور یہ واضح کیا کہ ہم خاصی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمیں فوری امداد کی ضرورت ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہمیں کچھ لڑاکا ہوائی جہاز، طیّارہ شکن توپیں اور گولا بارود فوراً درکار ہیں۔ ایوّب خاں کی خواہش تھی کہ یہ امداد انڈونیشیا کے راستے سے آئے، چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق میں نے تجویز کیا کہ جو ساز و سامان چین ہمیں دے سکتا ہو وہ انڈونیشیا روانہ کر دیا جائے، وہاں سے اُسے پاکستان لے جانے کا بندوبست ہم خود کر لیں گے۔



عوامی جمہوریہ چین کے وزیراعظم چو این لائی

چواین لائی کو اس تجویز پر کچھ تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ انڈونیشیا کے راستے نقل وحمل میں غیر ضروری پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور بہرحال وقت بہت زیادہ لگے گا۔ اِس سے کہیں زیادہ آسان صورت یہ ہوگی کہ طیّارے کوہ قراقرم پر سے پرواز کرتے ہوئے براہِ راست پاکستان پہنچ جائیں۔ طیّارہ شکن ہتھیار بھی سیدھے پاکستان پہنچائے جا سکتے تھے۔ چواین لائی نے اُن جہازوں اور طیّارہ شکن توپوں کی ٹھیک ٹھیک تعداد بھی بتائی جو چین ہمیں اُس وقت دے سکتا تھا۔ نیز وہ تاریخیں بھی بتا دیں جب یہ ساز و سامان ترسیل کے لیے تیّار ہوگا۔ میں نے اس فوری پیش کش پر اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کی پیش کش کی تفصیلوں سے میں اپنی حکومت کو مطلع کروں گا، لیکن اس فیصلے کے لیے کہ ترسیل کا کون سا راستہ اختیار کیا جائے مجھے حکومت کی ہدایت حاصل کرنی ہوگی۔ میں اُسی شام کو جکارتا پہنچ کر صدر سوکارنو سے ملنے والا تھا۔ اور میں نے چواین لائی کو بتایا کہ میں سوکارنو سے مِن جملہ اور معاملات کے اِس امر پر بھی گفتگو کروں گا کہ چینی ساز و سامان انڈونیشیا کے راستے پاکستان بھیجنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

پھر میں نے پاکستان کے نقطۂ نظر سے جنگ کی صورتِ حال کی وضاحت کی اور عرض کیا کہ ہمارے خیال میں ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر چینی فوجوں کی نقل وحرکت سے مغربی محاذ پر ہمارے خلاف دباؤ میں کمی ہو جائے گی۔ اِس پر چواین لائی نے اِس بات کی وضاحت چاہی کہ ہم کس قسم کی نقل وحرکت چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ چین کی طرف سے کسی قسم کی فوجی نقل وحرکت کے کچھ بین الاقوامی اثرات ضرور ہوں گے۔ ان اثرات کا ٹھیک اندازہ تو چین کے حکمران ہی کر سکتے ہیں،

ہم صرف اِتنی درخواست کر سکتے ہیں کہ اُس میں وہ پاکستان کی حالت کا پورا لحاظ رکھیں چینی فوجوں کی نقل و حرکت کی نوعیت اور اُس کی وسعت کا تعین تو خود چین ہی کر سکتا ہے، لیکن ہماری فوری ضرورت صرف اِتنی ہے کہ وہ جارحانہ کارروائی کیے بغیر اپنی فوجیں ہندوستان کی سرحدوں پر جمع کر دے۔ کسی مزید فوجی کارروائی کا فیصلہ آنے والے حالات و حادثات پر منحصر ہوگا۔ وزیرِاعظم نے جواب دیا کہ اگر چین نے اِس قسم کا کوئی بھی قدم اُٹھایا تو اُس کے سنگین بین الاقوامی اثرات مرتب ہوں گے۔ تاہم اُنھوں نے ہمیں یقین دلایا کہ پاکستان کی حفاظت کو چین نہایت اہم سمجھتا ہے اور اُس پر بیرونی حملے کا خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا اگلے روز تک میں پیکنگ میں ٹھہر سکتا ہوں، کیونکہ اِس عرصے میں وہ مجھے کوئی قطعی جواب دے سکیں گے۔ میں نے بتایا کہ مجھے اُسی شام صدر سوکارنو سے ملاقات کے لیے جکارتا روانہ ہونا ہے۔ اور اگر مجھے اُس وقت تک کوئی جواب مِل جائے تو میں ممنون ہوں گا۔ اِس پر وزیرِاعظم میز سے ہٹ کر ٹیلیفون کے پاس چلے گئے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد لوٹے تو ہمیں بتایا کہ وہ صدرِ مملکت 'لیوشاؤچی' سے باتیں کر رہے تھے۔ اُن دونوں کا خیال تھا کہ میری تجویز کے اثرات اتنے سنگین اور دور رس ہوں گے کہ اُس پر صدر ایوبؔ سے براہِ راست گفتگو ضروری ہے۔ چو این لائی نے تجویز کیا کہ ایوبؔ خاں سے اُن کی ملاقات پیکنگ یا راولپنڈی میں ہو سکتی ہے، یا کسی اور جگہ جہاں ہمارے صدر کو سہولت ہو۔ میں نے کہا کہ میں اُن کی تجویز سے ایوبؔ خاں کو آگاہ کر دوں گا۔ چو این لائی نے کہا کہ چین کے حکمران یہ جاننا چاہیں گے کہ آیا پاکستان واقعی اُس وقت تک لڑنے کا تہیہ کر چکا ہے

جب تک کہ اُس کے بنیادی سیاسی مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے یقین ہے کہ پاکستان آخری دم تک لڑے گا۔

جکارتا کے لیے روانگی سے پہلے میں نے چینی وزیرِاعظم کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں نے طے کیا کہ وطن واپسی پر میں کچھ دیر کے لیے پیکنگ ٹھہر کر چواین لائی کو اپنی اور صدر سوکارنو کی گفتگو سے آگاہ کروں۔ آدھی رات کے قریب میں پیکنگ سے روانہ ہوا اور کینٹن پر جہاز میں تیل بھروانے کے لیے ذرا دیر رُک کر ہم اپنی منزل کی طرف پرواز کرنے لگے۔ جب ہمارا بوئنگ طیارہ جنوب میں بحرِ چین کے اُوپر اُڑ رہا تھا تو میں پھر جنگ کی صورتِ حال اور چین کی مداخلت کے ممکنہ نتائج وعواقب کے متعلق غور کرنے لگا۔ چواین لائی نے میری تجویز کا جو جواب دیا تھا وہ اُس سے زیادہ واضح اور ایجابی تھا جس کی ہم توقع کر سکتے تھے۔ اُن کی دل نوازی اور مسئلوں کی جزئیات پر اُن کے عبور سے میں بہت متاثر ہوا۔ وہ مختلف قسم کے ہتھیاروں کی کارکردگی سے پوری طرح واقف تھے، اور گو کہ ہم نے اِس ضمن میں خاصی تفصیل سے بحث کی، چواین لائی کو اعداد و شمار کا حوالہ دیتے وقت ایک مرتبہ بھی کسی تحریری یادداشت پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہ ہوئی۔

جب ہمارا جہاز انڈونیشیا کی فضاؤں میں داخل ہوا تو اُسے جکارتا سے ایک سو میل دور ایک فوجی ہوائی میدان پر اُترنے کو کہا گیا جو بمبار طیاروں کا اڈّا تھا۔ اُترنے پر ہمارا استقبال میرے دوست عمر دھانی نے کیا جو اُس زمانے میں انڈونیشیا کی فضائی فوج کے سربراہ تھے۔ انھوں نے بتایا کہ صدر سوکارنو میرے اِس دورے کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے حکم دیا تھا کہ ہمارا طیارہ جکارتا



انڈونیشیا کے سابق صدر سوئیکارنو

کے عام ہوائی اُڈے پر نہ اُترے۔ اس کے بعد فوراً عمر دھانی اور میں انڈونیشیا کے ایک فوجی طیّارے میں جکارتا کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں اُتر کر موٹر سے ایوانِ صدر پہنچے۔ اِس سے ڈیڑھ سال پہلے میں انڈونیشیا ہی میں صدر سوکارنو سے مل چکا تھا۔ اب وہ فوراً آ کر مجھ سے ملے اور میں نے اُن کی شخصیت اور طور طریقے بالکل معمول کے مطابق پائے۔ میں نے ایوّب خاں کا مراسلہ انھیں دیا اور انھوں نے اسے غور سے پڑھا۔ اُس خط میں ہمارے صدر نے لکھا تھا کہ پاکستان کو اُمید ہے کہ اس پر جو وقت پڑا ہے اُس میں انڈونیشیا اُس کی بھرپور مدد کرے گا۔ اُسے پڑھ کر سوکارنو نے کہا کہ یہ آپ ہی کے ملک کے لیے نہیں، ہمارے ملک کے لیے بھی نازک وقت ہے اور آپ کی ضرورت ہماری ضرورت ہے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ پچھلے دن انھوں نے اپنی جنگی کونسل کا ایک اجلاس بُلایا تھا اور اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ انڈونیشیا پاکستان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ صدر نے کہا کہ پاکستان پر ہندوستانی حملے کو وہ انڈونیشیا پر بھی حملہ تصوّر کرتے ہیں۔ اور ہماری ہر ممکن امداد کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں انڈونیشیا کو اپنا ہی ملک تصوّر کروں اور وہاں ایسی جو چیز بھی مجھے دکھائی دے جو اُس مصیبت کے وقت میرے ملک کے کام آ سکے وہ اُٹھا لے جاؤں "مگر یہ بات نہ بھولیے گا کہ ہمیں بھی ایک مسئلہ درپیش ہے، یعنی ملیشیا سے ہماری آویزش۔" لہٰذا یہ فیصلہ کرتے وقت کہ میں وہاں سے پاکستان کے لیے کیا کچھ لے جاؤں، مجھے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ خود انڈونیشیا کی ضروریات کیا ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے سباندریو کو بھی (جو اُن دنوں وزیر خارجہ اور قومی دفاع کی مشترکہ کمان کے سربراہ تھے) یہی ہدایت کی

تھی، اور کہا کہ تفصیلات پر میں سباندریو اور عمر دھانی سے بات چیت کر لوں۔

اِس ملاقات کے کوئی اٹھارہ مہینے بعد یہ خبر آئی کہ سکارنو کو صدارت سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اُن کی کمزوریوں سے قطعِ نظر، جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی دوسرے شخص نے اُس نازک گھڑی میں پاکستان دوستی کا ایسا مظاہرہ نہیں کیا۔ اُن کی پُرخلوص اور برادرانہ پیش کش کو پاکستان کی آئندہ نسلیں ہمیشہ یاد رکھیں گی اور اگر خود سوکارنو کے ہم وطنوں نے اُسے بُھلا بھی دیا تو پاکستانی قوم یہ کبھی نہ بھولے گی کہ ہمارے ملک پر جب وقت پڑا تھا تو انڈونیشیا نے اپنے اسلحہ خانے کی کنجی ہمارے حوالے کر دی تھی۔ خود اُس کے پاس اُس زمانے میں ہتھیار اور دوسرا سامانِ جنگ کچھ وافر نہ تھا، لیکن اِس بات سے اُس کی پیش کش کی قدر گھٹی نہیں بلکہ بڑھ گئی۔ ایک ایسے ملک کے لیے جسے خود خاصے سنگین مسئلوں کا سامنا تھا، اِس قسم کی فیاضانہ پیش کش کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اور مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ پاکستان شاید کبھی انڈونیشیا کے اس احسان کا بدلہ نہ دے سکے گا۔

سوکارنو میں ایک غیر معمولی بات اُن کی شانِ دلنوازی تھی اور اُن سے ملنے کے بعد اِس بات پر کوئی حیرت نہ رہتی کہ انھوں نے اتنے طویل عرصے تک اپنی قوم کے دلوں پر راج کیا۔ اُن سے رخصت ہو کر میں نے سباندریو اور عمر دھانی سے گفتگو کی اور انھیں بتایا کہ ہمیں چند اعلیٰ کارکردگی کے لڑاکا طیارے فوراً درکار ہیں۔ انڈونیشیا کے پاس کچھ (MIG-21) جہاز تھے میں نے دریافت کیا کہ اُن کی صف بندی کیوں کر ہوتی ہے۔ عمر دھانی نے بتایا کہ اُن کے پاس صرف بارہ طیّارے تھے جن میں سے چار مغربی جاوا اور چار مشرقی جاوا کے دفاع پر مامور تھے اور باقی چار طیّارے فاضل

تھے جن کو اس لیے "محفوظ" رکھا گیا تھا کہ اگر دوسرے دستوں کا کوئی طیّارہ ضائع ہو جائے تو اُس کی جگہ فوراً پُر کی جا سکے۔ انڈونیشیا کی اپنی ضرورتوں، اور صدر سوکارنو کے بیان کے پیشِ نظر میں نے سوچا کہ ہمیں اُن سے چار مِگ ۲۱ طیاروں سے زیادہ کوئی مطالبہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ چار طیّارے ہماری فضائیہ کی قوّت میں کوئی بہت زیادہ اضافہ تو نہ کر سکتے تھے لیکن ہمارے اپنے گیارہ ایف ۱۰۴ (F 104) طیّاروں کے ساتھ مِل کر دشمن کی مزاحمت میں ہمارے لیے ضرور مفید ثابت ہوتے۔ چنانچہ میں نے عمر دھانی سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے چار فاضل طیّارے ہمیں دے سکیں گے۔ وہ بولے: "آپ ہمارے صدر کی گفتگو سُن چکے ہیں اور آپ جو چاہیں لے جا سکتے ہیں۔" پھر میں نے اُن کے مگ ۱۹ (MIG - 19) طیاروں کے متعلق دریافت کیا تو عمر دھانی وہ سب ہمیں دینے پر تیار ہو گئے۔ ان کے علاوہ دھانی نے ہمیں چند مگ ۱۵ (MIG - 15) بھی پیش کیے۔ اِن طیّاروں کو پاکستان پہنچانے کے بارے میں یہ طے ہوا کہ انڈونیشیا کی فضائیہ اُن کے حصّے الگ الگ کر کے اُن کو بند کرے گی اور پھر انڈونیشیا ہی کے بحری جہاز انھیں پاکستان لے جائیں گے۔ بحریہ کے سربراہ، مارتا دناتا، بھی وہاں موجود تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ بخوشی اس سازوسامان کو کراچی پہنچانے کی ذمہ داری قبول کریں گے، اور یہ کہ انھیں ہندوستانی بحریہ کی طرف سے مداخلت کا تو کوئی خدشہ نہیں۔ وہ بولے کہ حفاظتی دستہ ان مال بردار جہازوں کے ہمرکاب ہوگا اور وہ اس کا پکّا انتظام کریں گے کہ سازوسامان پوری حفاظت سے کراچی پہنچ جائے۔

انڈونیشیا سے امداد کے بارے میں یہ مذاکرات ختم ہوئے تو میں نے

پیکنگ کے راستے وطن واپسی کا ارادہ کیا۔ جب میں رخصت ہونے کے لیے اُٹھا تو مارتا دِناتا نے پوچھا کہ کیا ہم اُن کے ملک سے صرف اتنی ہی مدد چاہتے تھے۔ میں نے کہا: "آپ اِس سے زیادہ اور کیا کرسکتے ہیں؟" اس پر وہ بولے: "کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ ہم انڈمان کے جزیرے پر قبضہ کرلیں؟ نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ انڈمان اور نکوبار کے جزیرے سماترا سے ملحق ہیں اور بہرحال مشرقی پاکستان اور انڈونیشیا کے درمیان واقع ہیں۔ اُن پر ہندوستان کا کیا حق ہے؟" اس پر میں نے یہ رائے دی کہ پہلے وہ اس مسئلے پر اپنے صدر سے بحث کرلیں۔ موجودہ صورتِ حال میں اگر انڈونیشیا ان جزیروں پر قبضہ کرے تو ظاہر ہے کہ پاکستان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن بدقسمتی سے ہم خود اس وقت اِس کام میں انڈونیشیا کی مدد کرنے کے قابل نہیں۔ یہ سُن کر مارتا دِناتا بولے: "بہرحال انڈونیشیا کی بحری فوج فوراً اِن جزیروں کے سمندری راستوں کی حفاظتی گشت شروع کردے گی اور طیاروں کے ذریعے دیکھ بھال کرکے یہ معلوم کرے گی کہ ہندوستانیوں نے وہاں کیا کچھ جمع کر رکھا ہے۔" میں نے امیرالبحر کی اس فیاضانہ پیش کش پر اُن کا شکریہ ادا کیا اور پھر عمر دھانی کے ساتھ اُس فوجی ہوائی میدان کے لیے روانہ ہوا جہاں پی آئی اے کا بوئنگ ہمارا منتظر تھا۔

مارتا دِناتا اپنے قول کے پکے نکلے اور انھوں نے پاکستانی بحریہ کے لیے خاصی مقدار میں امدادی سازوسامان فراہم کیا۔ انھوں نے حکم جاری کیا کہ دو آبدوز اور چار اوسا OSSA Missile Boats (ہتھیار پھینکنے والی کشتیاں) فوراً پاکستان منتقل کردی جائیں۔ اُس سے پچھلے سال پاکستانی بحریہ کے جہازوں نے انڈونیشیا کا

ایک خیر سگالی دورہ کیا تھا۔ اور دونوں ملکوں کی بحری فوجوں کے درمیان بڑے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اب پاکستان پر وقت پڑا تو انڈونیشیا نے دِل کھول کر اُس کی مدد کی۔ اُس کی اعلیٰ کمان نے پاکستان کی اشد ضرورتوں کو پوری طرح محسوس کیا اور ہندوستان اور پاکستان کی بحری قوّت میں تفاوت کے پیشِ نظر مارتا دِناتا نے بڑے خلوص اور بڑی عجلت سے امدادی کارروائی کا انتظام کیا۔ وہ وقت خود انڈونیشیا کی بحریہ کے لیے خاصا کٹھن تھا۔ آبنائے ملکّا کے قضیے میں انڈونیشیا اور برطانیہ کے درمیان محاذ آرائی شروع ہونے والی تھی اور اس کے پیشِ نظر برطانیہ نے بڑے جنگی جہازوں کا ایک بڑا خاص طور پر اس آبنائے پر تعینّات کر دیا تھا۔ اِدھر مزاحمت کے لیے انڈونیشیا کے پاس صرف مِسائل کشتیاں تھیں۔ ایک اور دِقّت یہ تھی کہ اُس کے پاس جو آبدوز اور مِسائل کشتیاں تھیں۔ وہ اُس نے سوویت یونین سے ایک معاہدہ کی رو سے حاصل کی تھیں جس میں انھیں کسی دوسرے ملک کو منتقل کرنے کی ممانعت تھی۔ اِن حالات میں سوکارنو اور اُن کے امیر البحر کے لیے یہ بڑی ہمّت کی بات تھی کہ وہ یہ جہاز پاکستان بھیج دیں۔ انھوں نے خود یہ پیش کش کر کے پاکستان کے لیے غیر معمولی خلوص اور برادرانہ جذبات کا مظاہرہ کیا۔

وطن واپسی پر میں نے پاکستانی بحریہ کے سربراہ، ایڈمرل افضل الرّحمٰن خاں کو جکارتا میں اپنے مذاکرات سے آگاہ کیا اور انھوں نے مارتا دِناتا سے براہِ راست رابطہ قائم کیا۔ انڈونیشیا نے جن آبدوز اور مِسائل کشتیوں کی پیش کش کی تھی وہ حسبِ وعدہ روانہ ہوئیں، لیکن سفر لمبا تھا اور جب وہ پاکستان کی بحری سرحدوں میں پہنچیں تو لڑائی

ختم ہو چکی تھی تاہم وہ اُس وقت تک ٹھہری رہیں جب تک دوبارہ جنگ شروع ہو جانے کا خطرہ بالکل ٹل نہ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اُن کشتیوں کو اپنی حفاظتی گشت کے دوران میں براہِ راست پاکستان جانے کا حکم ملا تھا اور انھیں اتنی مہلت بھی نہ دی گئی تھی کہ اپنے ملک کی کسی بندرگاہ پر ٹھہر کر اپنے عملے کو لباس تبدیل کرنے کا وقت دیں۔

۱۹۶۶ء میں بحریہ سے سبکدوش ہونے کے بعد مارتادِناتا پاکستان میں سفیر مقرر ہوئے۔ انڈونیشیا کو اسلام آباد میں اپنی نمائندگی کے لیے اُن سے بڑھ کر پاکستان کا دوست کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ افسوس کہ اپنی تعیناتی کے دو ہی مہینے بعد وہ اپنے وطن میں ہیلی کوپٹر کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔

جکارتا سے پیکنگ واپس جا کر میں پھر چو این لائی سے ملا اور انھیں انڈونیشی حکمرانوں سے اپنی گفتگو سے مختصراً آگاہ کیا۔ ہماری سرحدوں پر جو حالات رونما ہو رہے تھے اُن کے متعلق تو پہلے ہی میری اُن کی بات چیت ہو چکی تھی اور وہ اُن پر اپنی تشویش کا اظہار کر چکے تھے۔ اِس ملاقات میں اُنھوں نے اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہ کی، البتہ اِس پر اصرار کیا کہ ایوب خاں سے اُن کی جلد ملاقات انتہائی ضروری ہے۔ انھوں نے اس خبر پر بھی تشویش کا اظہار کیا کہ پاکستان اقوام متحدہ کی ایک تجویز پر غور کر رہا ہے جس کی رو سے جنگ بند کر دی جائے گی اور بعض غیر جانبدار ملک جمّوں اور کشمیر میں جنگ بندی کی نگرانی کے لیے فوجیں فراہم کریں گے۔ چو این لائی نے اس قسم کی کسی تجویز کے متعلق اپنے شبہات کا اظہار کیا اور کہا کہ آج کل کوئی ملک صحیح معنوں میں غیر جانبدار نہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اقوام متحدہ کسی کام کے لائق نہیں اور وہ کبھی کوئی مسئلہ حل نہ

کرسکی تھی۔ اُس کی فوجیں دنیا میں جہاں کہیں بھی استعمال ہوئیں انھوں نے سامراجی طاقتوں کے کارندوں کا کام کیا اور مسائل کو سلجھانے کے بجائے نئے مسئلے پیدا کیے۔ اقوامِ متحدہ کی پوری تاریخ میں صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ اُس کی تعینات کی ہوئی فوج کسی ملک میں گئی اور دیانت داری سے وہاں اپنی خدمت انجام دے کر لوٹ آئی۔ یہ پاکستان کا وہ فوجی دستہ تھا جو اقوامِ متحدہ کی طرف سے انڈونیشیا بھیجا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر پاکستان نے اقوامِ متحدہ کی اس قسم کی کوئی تجویز منظور کرلی تو یہ اُس کی سادہ لوحی ہوگی۔ چو این لائی انگریزی سمجھتے تھے اور جب مترجم نے لفظ (NAIVE) (سادہ لوح) استعمال کیا تو وزیرِ اعظم نے اُسے ٹوکا اور کہا کہ اُن کا مطلب اس سے صحیح ادا نہیں ہوا (UNWISE) (غیر دانشمند) اُن کے مفہوم کے لیے زیادہ موزوں لفظ ہوگا۔

بہر حال اُن کے مفہوم کے لیے جو لفظ بھی زیادہ صحیح ہو، اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ اِس معاملے میں اُن کا مشورہ بالکل صحیح تھا۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان نے اقوامِ متحدہ کی تجویز کا جو جواب دیا تھا وہ اُن کی توقعات پر تو پورا نہ اُترا، تاہم اس حد تک قابلِ اطمینان ہے کہ اُس میں جو شرطیں رکھی گئی ہیں وہ ہندوستان فی الوقت قبول نہیں کرسکتا۔ اور اگر جیسا کہ اُن کا اندازہ تھا، ہندوستان نے تجویز رد کردی، تو اگلی مرتبہ پاکستان اِس قابل ہوگا کہ امن معاہدے کے سلسلے میں زیادہ سخت شرطوں پر اصرار کرسکے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان کو ہماری شرطیں منظور کرنی پڑیں گی۔ انھیں یا مجھے اُس وقت کیا معلوم تھا کہ دس دن میں پاکستان کسی شرط پر بھی جنگ ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

میں تین دن میں اپنا یہ دورہ ختم کر کے راولپنڈی لوٹ آیا اور ایوب خاں کو اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔ میں نے تجویز کیا کہ چو این لائی کے حسبِ خواہش وہ چینی رہنماؤں سے ملاقات کریں۔ ایوب خاں اس کے لیے تیار نہ تھے، انھوں نے کہا ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اِس قسم کی ملاقات سے اُن حالات میں کیا حاصل ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے جواب دیا: "ہندوستان کی شمالی سرحدوں کے متعلق کوئی اہم ذمے داری قبول کرنے سے پہلے وہ یہ یقین کر لینا چاہتے ہیں کہ ہم واقعی جنگ جاری رکھنے کا تہیّہ کر چکے ہیں۔ وہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا آپ واقعی جنگ کو تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں۔" ایوب خاں کو معلوم تھا کہ ایسی روبرو ملاقات میں اُن کی آنکھوں سے کیا ظاہر ہوگا۔ اِس لیے چینی لیڈروں کے بار بار اصرار کے باوجود وہ اپنے مغربی حلیفوں کے ڈر سے اِس ملاقات کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ چینی رہنماؤں سے اُن کی اگلی ملاقات جنگ ختم ہونے کے کچھ عرصے بعد ہوئی۔

پانچواں باب

پاکستان سے میری غیر موجودگی کے دوران ہندوستانی فضائیہ نے پشاور پر بمباری کی تھی اور گو کہ ہوائی میدان کو صرف برائے نام نقصان پہنچا تھا، شہر اور نواح کے دیہاتوں میں کئی شہری ہلاک ہوئے تھے۔ ہوائی آمد و رفت کی نگرانی کے مرکز کی عمارت اور ایک ہینگر (سایہ بان جس کے نیچے ہوائی جہاز کھڑے کیے جاتے ہیں) کو کچھ نقصان پہنچا تھا، لیکن خوش قسمتی سے کوئی جہاز ضائع نہیں ہوا۔ اس وقت ہمارے بمبار ہوائی میدان میں صف آرا تھے، ان کے ٹینک تیل سے پُر تھے اور وہ بموں سے لیس، ہندوستانی ہوائی میدانوں پر حملے کے لیے پرواز کرنے کو تیار تھے۔ ہندوستانی طیاروں کے حملے سے بم کی کرچیں ہمارے بعض بمباروں کو لگی تھیں، لیکن کسی جہاز کو کوئی شدید نقصان نہیں پہنچا۔ ہندوستانی حملے کے ختم ہوتے ہی ہمارے بمبار جوابی کارروائی کے لیے روانہ ہو گئے اور دشمن کے ہوائی میدانوں پر کچھ زیادہ گہرے نشان چھوڑ آئے۔ اِس کے بعد ہندوستانیوں نے کوہاٹ پر

بمباری کی اور پشاور پر دوبارہ حملہ کیا۔ اِن دونوں حملوں میں ہماری فضائیہ کے سازوسامان یا عمارتوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا، عام شہریوں کو البتہ پھر نقصان اٹھانا پڑا۔

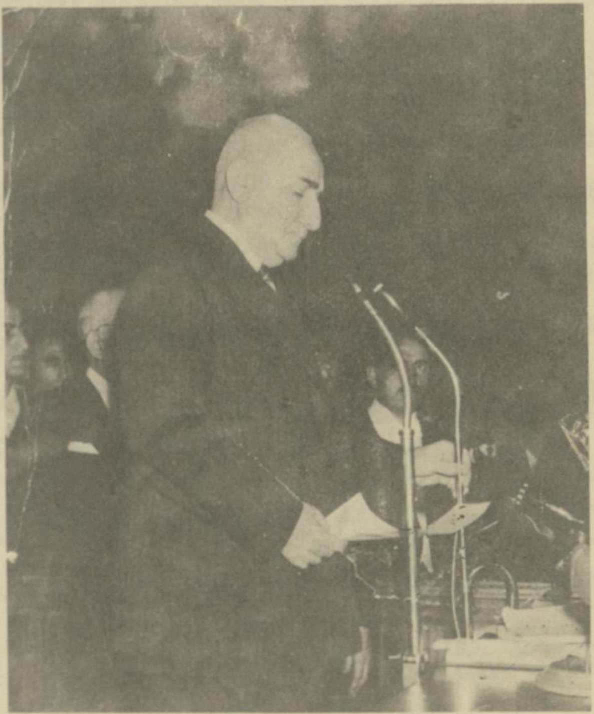
سرگودھا پر بھی دشمن کے کینبرا طیّاروں نے رات کو حملہ کیا تھا۔ جنگ کے پورے عرصے کے دوران میں سرگودھا کے ہوائی میدان پر ہندوستانیوں کی خاص توجہ رہی اور وہ اُن کے شبینہ فضائی حملوں کا سب سے اہم نشانہ رہا۔ انھوں نے اِس میدان کے اِردگرد کُل پانچ لاکھ پاؤنڈ بم گرائے، لیکن ان حملوں سے ہمیں بہت ہی کم نقصان پہنچا۔ ہوائی میدان پر ایک آگ بجھانے والی مشین کو نقصان پہنچا اور اس کا ڈرائیور زخمی ہوگیا، اور ہوائی اڈے کے قریب پچیس فٹ کا ایک گڑھا ہوگیا۔ ایک بم ہوائی میدان سے چھ میل پرے ایک دیہات پر گرا اور اس سے اکیّس شہری ہلاک ہوگئے

اِن بمباریوں کے سوا دشمن کی فضائیہ نے کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہ کی اور فضا ہمارے طیّاروں کے قابو میں رہی۔ ہندوستانی فضائیہ نے دن کی روشنی میں حملہ کرنا بند کر دیا تھا اور رات میں بھی صرف اِکّا دکّا بمباریاں چند دن اور جاری رہیں۔ ان سے ہماری فضائیہ کو تھوڑی بہت پریشانی تو ہوئی، لیکن اس سے زیادہ ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔

فضا کے برعکس برّی میدانِ جنگ میں صورتِ حال کچھ اچھّی نہ تھی۔ ہماری بکتر بند فوج، جو گجرانوالہ، وزیر آباد کے علاقے میں منتقل کر دی گئی تھی، اس پر مامور تھی کہ لاہور اور راولپنڈی کے درمیان ریلوے لائن پر دشمن کی پیش قدمی کو روکے۔ لاہور

اور سیالکوٹ کے علاقوں (Sectors) میں ہندوستان نے کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن حملے کا زور ختم ہو چکا تھا اور جنگ میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔

ہماری فوجوں کے لیے سب سے زیادہ سنگین مسئلہ ہتھیاروں اور گولے بارود کا تھا، جو بہت تیزی سے صرف ہو رہے تھے۔ ان میں جو کمی واقع ہو رہی تھی اُسے پورا کرنا نہایت ضروری تھا۔ ہمارے تمام ہتھیار امریکی ساخت کے تھے اور جن ملکوں سے ہمیں مدد کی توقع ہو سکتی تھی اُن میں اس قسم کے ہتھیار صرف ترکی اور ایران کے پاس تھے۔ اُن کی اور ہماری فضائی فوجوں کے پاس طیّارے بھی ایک ہی قسم کے تھے۔ چنانچہ میں نے تہران اور انقرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ایوب خاں سے شہنشاہ ایران اور صدر گرسیل کے نام خط لے کر میں کراچی کے راستہ سفر پر روانہ ہوا۔ جنگ چھڑنے کے بعد پہلی دفعہ میں کراچی گیا تو میں نے شہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ ہوائی حملوں سے پناہ کے لیے خندقیں بڑے پیمانے پر کھودی گئی تھیں اور رات کو بلیک آؤٹ مکمل اور پوری طرح مؤثر تھا۔ چند ہندوستانی طیّاروں نے شہر پر پرواز کی تھی لیکن اِس کے کسی حصّے پر کوئی بم نہیں گرا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اِن "ہوائی حملوں" کی "کامیابی" کی خبریں نشر کرتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو نے کہا تھا کہ بندر روڈ کا علاقہ برباد ہو چکا ہے اور لیاری میں پاکستانی فضائیہ کے اڈّے کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ حقیقت میں لیاری اپنی بہت سی باتوں کے لیے "مشہور" ہے، مثلاً ماہی گیروں کی آبادی، بدبو اور بعض دوسری ناخوش گوار خصوصیتیں، لیکن لیاری میں کبھی کسی ہوائی اڈّے کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ ماری پور میں فضائی میدان ضرور تھا، لیکن اُس پر کوئی آنچ نہ آئی تھی۔ میں کراچی میں ایڈمرل فضل الرّحمان خاں سے بحریہ کے ہیڈ کوارٹر میں



ترکی کے سابق صدر جمال گرسل

ملا اور پھر القرہ روانہ ہوگیا۔

صدر گرسل سے ملا تو وہ بڑے لطف و عنایت سے پیش آئے۔ جنگ کی صورتِحال پر تبادلۂ خیال کے بعد اُنھوں نے کہا کہ پاکستان کی اِس آزمائش میں ترکی اُس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ اِس کے بعد میں فضائیہ کے سربراہ، جنرل تانسیل، سے اور وزیرِ اعظم جناب اور گیُلو سے بھی مِلا۔ یہ فوراً ظاہر ہوگیا کہ پاکستان کی صورتِ حال نے ترکی کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اُس کا سارا جنگی ساز و سامان امریکی ساخت کا تھا اور اپنی روزمرہ کی جنگی ضروریات کے لیے اُس کا تمام تر دارومدار امریکہ پر تھا۔ ایک اور دِقّت یہ تھی کہ ترکی، شمالی اوقیانوس کے فوجی معاہدے (NATO) میں شریک تھا اور اُس کی تمام فوجیں اور وسائل اُس تنظیم کے لیے وقف تھے۔ لہٰذا ترکی کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ نیٹو کو مطلع کیے اور اُس سے اجازت لیے بغیر پاکستان کو کسی قسم کے ہتھیار فراہم کرے۔ پھر یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ترکی کوئی بھاری ساز و سامان یا مشینیں، مثلاً ہوائی جہاز یا ٹینک، پاکستان بھیجے اور نیٹو میں ترکی کے حلیفوں کو خبر نہ ہو۔ وزیرِ اعظم نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ ایک مخلوط حکومت کے سربراہ ہیں، اور جیسا کہ مخلوط حکومتوں میں عموماً ہوتا ہے، اُس کے تمام اجزا ہر مسئلے پر ایک رائے نہیں رکھتے۔ "ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی کے معاملے میں وہ سب اصولاً اپنے پاکستانی بھائیوں کی حمایت میں متفق ہیں۔ لیکن اِس بات میں ایک رائے نہیں کہ اس حمایت کی عملی شکل کیسی ہو یا ہونی چاہیے۔ حکومت میں ایک پارٹی کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کو بھرپور امداد دینی چاہیئے، دوسرا گروہ احتیاط کو لازم جانتا ہے اور کہتا ہے جو کچھ مدد ممکن ہو ضرور بہم پہنچائی جائے لیکن اس طرح کہ

ترکی کے اپنے بین الاقوامی تعلقات پر کوئی زد نہ پڑے اور اُس عہد و پیمان پر کوئی حرف نہ آئے جو اس نے اپنے فوجی حلیفوں سے کر رکھا ہے ایک تیسری پارٹی کا رویہ اس سے بھی زیادہ محتاط ہے کیونکہ اُسے امریکی ردِ عمل کا زیادہ لحاظ ہے۔ وزیرِ اعظم نے مجھے بتایا کہ اِن تمام دقتوں اور پیچیدگیوں کے پیشِ نظر ترکی ہمیں گولا بارود اور ہتھیار تو دے سکے گا۔ لیکن جنگی طیّارے، اُن کے فاضل پُرزے اور ٹینک دینے سے انھوں نے معذوری ظاہر کی۔ پاکستان کی نازک صورتِ حال پر ترکی کے اس ردِّ عمل پر مجھے تعجب تو نہ ہوا لیکن کچھ مایوسی ضرور ہوئی۔ بہر حال میں نے وزیرِ اعظم کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو یہ واضح ہو گیا کہ اُن حالات میں ترکی نے جو کچھ مدد ہماری کی اُس سے زیادہ کی توقع بیجا تھی۔ ترکی ہمیں جو کچھ دے سکتا تھا وہ اس نے دِل کھول کر دیا اور پی۔ آئی۔ اے کے طیّارے ترکی سے امدادی سامان لانے میں پوری طرح مشغول رہے۔

تہران پہنچا تو شہنشاہ نے جلد ہی مجھے ملاقات کے لیے بُلا لیا۔ اُن کے نام ایوّب خاں نے جو خط بھیجا تھا اُس میں جنگ کے بارے میں ایران کے رویے پر مایوسی ظاہر کی تھی۔ چند ہی دن پہلے ایران اور ترکی کے وزرائے خارجہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ جس کے خاتمے پر ایک اعلامیہ بھی جاری ہوا تھا۔ اُس میں پاکستان کے ساتھ ہمدردی تو ضرور ظاہر کی گئی تھی، لیکن تان اس پر ٹوٹی تھی کہ اقوامِ متحدہ کی جنگ بندی کی تجویز دونوں فریقوں کو قبول کر لینا چاہیے۔ پاکستان میں اکثر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہمیں اِن حلیف ملکوں سے زیادہ پُرزور سفارتی حمایت کا حق تھا۔ ترکی میں ہمارے سفیر نے پاکستان کے دفترِ خارجہ کو اطلاع دی تھی کہ اعلامیہ میں جس بے دلی سے ہمارے ساتھ

ہمدردی ظاہر کی گئی تھی اُس کی تہ میں شاہِ ایران کا یہ اصرار تھا کہ ترکی اور ایران کو اس لڑائی میں جانب داری کا روّیہ اختیار نہ کرنا چاہیے۔

ترکی کی طرح ایران بھی فوجی اور اقتصادی امداد کے لیئے امریکہ کا محتاج تھا اور لڑائی سے جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اُس میں ایران کے لیئے امریکی دباؤ کے مقابلے میں ڈٹ جانا انتہائی مشکل تھا۔ ایران اور ترکی کے مشترکہ اعلامیہ کی عبارت پاکستان کے حق میں مفید نہ تھی اور اُس کے پیشِ نظر پاکستان کے لیے یہ مشکل ہو گیا تھا کہ جنگ بندی کے بارے میں مذاکرات میں کوئی سخت روّیہ اختیار کرے۔ ہمارے دفترِ خارجہ کی اطلاعات کے مطابق اِس عبارت کے وضع کرنے میں زیادہ حصّہ ایران کا تھا۔ چنانچہ ایوّب خاں نے شاہ ایران کو جو خط بھیجا تھا اُس میں اُنھوں نے ایران اور ترکی کے وزرائے خارجہ کے مذاکرات میں ایران کی کارفرمائی پر مایوسی ظاہر کی تھی۔ انھوں نے صاف صاف لکھا تھا کہ اس کٹھن وقت میں پاکستان کو ایران سے بھرپور ہمدردی کا حق تھا۔ شاہ نے یہ خط دوبار پڑھا اُن کے بشرے سے ظاہر ہوا کہ انھیں ایوّب خاں کی طرزِ شکایت سے دُکھ ہوا' اور اس بات سے بھی کہ ایران و ترکی کے مذاکرات میں ایران کے عمل اور اس کی نیت کو پاکستان نے شبہے کی نظر سے دیکھا۔ شاہ نے کہا کہ سب سے زیادہ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ انھیں اس ضمن میں جو کچھ معلوم ہے وہ اس کو پوری طرح ظاہر نہیں کر سکتے۔ اگر وہ سب کچھ بتا سکتے تو وہ ایوّب خاں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتے کہ اعلامیہ کی عبارت کا جو اثر ہوا تھا اس کا ذِمّے دار ایران نہیں۔ شاہ نے جنگ کی صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا اور پاکستانی فضائیہ کی کارکردگی پر مجھے مُبارک باد

دی۔ اُن دنوں ایران میں قومی تعطیلات تھیں اور اس کے باعث پاکستان کو اُس فوجی سامان کے حصول میں کچھ دقتوں کا سامنا تھا جو ایران اُس کے لیے مختص کر چکا تھا۔ لہٰذا اِس موقع پر میں نے شاہ سے دریافت کیا کہ کیا وہ ہماری سہولت کے لیے یہ حکم صادر کر دیں گے کہ متعلقہ عملہ چھٹیوں کے دوران میں ہمارا کام نبٹا دے۔ اِس پر شاہ نے میری موجودگی میں حکم دیا کہ سامان کی ترسیل کے لیے عملہ دِن رات کام کرے اور ایران کے ہتھیاروں اور گولے بارود کے ذخیرے پاکستان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے وقف کر دیے جائیں۔ ترکی کے وزیرِ اعظم اور گیلپو کی طرح شاہ نے بھی لڑاکا طیارے پاکستان کو دینے سے معذوری ظاہر کی، کیونکہ امریکہ کا فوجی امداد کا عملہ ان طیاروں کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ بہرحال شاہ نے مجھ سے کہا کہ پاکستان کو جن طیاروں اور آلات کی ضرورت ہے اس کی تفصیلی فہرست فراہم کی جائے۔ میں یہ فہرست پاکستان سے ساتھ لایا تھا اور وہ میں نے ایرانی حکّام کے حوالے کر دی۔

شاہ سے ملاقات کے بعد میں وطن لوٹا اور کراچی کے راستے پنڈی پہنچا ترکی اور ایران دونوں ملکوں میں میرا استقبال گرم جوشی اور ہمدردی سے کیا گیا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اُن کے عوام کو صورتِ حال پر سخت تشویش ہے۔ ان ملکوں اور پاکستان کے درمیان گہرے برادرانہ تعلقات تھے اور اگر اس کے باوجود اُن کی حکومتیں ہندوستان سے ہماری جنگ میں کھلم کھلا ہمارا ساتھ نہ دے سکیں اور ہماری بھرپور امداد نہ کر سکیں تو پھر اس میں وہ واقعی مجبور تھیں۔ دونوں ملکوں کے امریکہ سے بہت گہرے تعلقات تھے اور دونوں عوامی جمہوریہ چین کو کچھ شبہے کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اِن متضاد عوامل کی

کشاکش میں ان کی آزادیٔ عمل محدود ہوگئی تھی اور ان پریشان کن حالات میں اُنھوں نے جو کچھ پاکستان کے لیے کیا اُس سے زیادہ کی توقع کرنا بیجا تھا۔ چونکہ جنگ اچانک شروع ہو گئی تھی، اور کم از کم ہماری حکومت اُس کے لیے تیار نہ تھی، اس لیے ہم پہلے سے اپنے ان حلیف ملکوں کو آگاہ نہ کر سکے تھے کہ ہمیں اُن سے بھرپور مدد کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے جب انقرہ اور تہران کا دورہ کیا اُس وقت جنگ شروع ہوئے چند ہی دن گذرے تھے، اِس کے باوجود جس امداد کا ترکی اور ایران نے وعدہ کیا، اور جو ہمیں ملی، وہ بلا تاخیر بھیجی گئی اور موثر بھی ثابت ہوئی۔ پاکستان اور ہندوستان میں جس قسم کی جنگ ہو رہی تھی اُس میں کسی دوسرے ملک کا ایک دم اُلجھ پڑنا آسان نہ تھا، یہ عمل وقت چاہتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ جنگ کُل سترہ دن جاری رہی اور اُس کے آغاز کے دس ہی دن کے اندر جنگ بندی کے لیے بات چیت اور کوششوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس صورت میں ہمارے لیے یہ توقع معقول نہ ہوتی کہ ایران یا ترکی کھلم کھلا ہماری بھرپور مدد کا بیڑا اُٹھا لیں۔

ترکی میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں نے سُنا تھا کہ غلام فاروق ہمارے صدر کے دفاعی امور کے مشیر مقرر ہو گئے ہیں۔ میں پنڈی پہنچا تو مجھے یہ پیغام ملا کہ وہ فوراً مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پہلے ایوّب خاں، ان کے وزیرِ خارجہ اور وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کو اپنے دورے کے نتیجے سے آگاہ کیا، اور پھر اُسی شام میں غلام فاروق سے ملا۔ وہ بڑی زوردار شخصیت اور قوّتِ عمل کے مالک ہیں، اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنی نئی ذمہ داریوں میں جوش و خروش سے منہمک ہیں۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ مشیر برائے دفاع

کی حیثیت سے اُن کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہوگی کہ فوجوں کے لیے گولہ بارود اور سامانِ جنگ کافی مقدار میں فراہم کریں تاکہ جنگی کارروائیاں بے خلل جاری رکھی جاسکیں۔ میں خود بغیر کسی عہدے پر تقرّر کے یہی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اس کام کے لیے میں نے برّی، بحری اور فضائی تینوں افواج سے ضروری عملے کی خدمات حاصل کرلی تھیں اور اس نے وزارتِ دفاع میں کام بھی شروع کردیا تھا۔ چنانچہ میں نے غلام فاروق کو بتایا کہ میں اس کام میں ہر مدد اور مشورے کے لیے حاضر ہوں۔ اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ کام ہوا تھا یا جو منصوبے بنائے گئے تھے اُن سے میں نے انھیں آگاہ کیا۔ میرے خیال میں صورتِ حال قابلِ اطمینان تھی، اور گو کہ ہمیں بعض قسم کے گولے بارود کی قلّت کا سامنا تھا مجھے یقین تھا کہ متعدد بحری جہاز اور پی آئی اے کے کانسٹیلیشن (Constellation) اور بوئنگ طیّارے جو ساز و سامان لے کر آرہے تھے۔ اُس سے یہ کمی پوری ہوجائے گی۔ اور ہماری فوجیں ضروری آلات اور سامان سے محروم نہ ہوں گی۔ جنگ کے باقی دنوں میں ایک خود ساختہ رضاکار منتظم کی حیثیت سے خدمت کرتا رہا اور اس کے اختتام پر کراچی لوٹ گیا۔

غلام فاروق نے مجھے بتایا کہ اُن کے تقرر کی تجویز صدر ایوب سے مغربی پاکستان کے گورنر، نواب امیر محمّد خاں کالا باغ نے اور ایئر مارشل نور خاں نے کی تھی۔ نور خاں نے ایوب خاں سے کہا تھا کہ انھیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو وہ خدمت انجام دے سکے جو دوسری جنگِ عظیم میں چرچل کے لیے لارڈ بیور بروک

له (Lord Beaver Brook) نے کی تھی اور اس کے لیے غلام فاروق نہایت موزوں شخص ہوں گے۔ افسوس کہ پاکستان کے پاس کوئی چرچل نہ تھا، اگر ہوتا تو آج ملک کی تقدیر ہی کچھ اور ہوتی۔

له لارڈ بیور برک مشہور برطانوی سیاستدان اور کئی انگریزی اخباروں کے مالک۔ اپنی غیر معمولی سرگرمی عمل اور قوتِ ارادی کے لیے معروف تھے۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں طیّارے سازی کی صنعت کے وزیر تھے اور اس حیثیت سے جنگ میں برطانیہ کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۴ء میں ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

چھٹا باب

راولپنڈی میں جنگی کارروائیوں کی تنظیم کا عجب حال تھا۔ ایسے وقت میں چوٹی پر رہ نمائی اور نگرانی کے جس مربوط نظام کی ضرورت ہوتی ہے وہ عملاً مفقود تھا۔ اِس پر مجھے یاد آیا کہ چھ سال قبل صدرِ مملکت نے تینوں فوجوں کے سربراہوں سے ایک ملاقات کی تھی جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ جنگ کی صورت میں اعلیٰ کمان اور نگرانی کے مسئلوں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ ہمیں پہلے سے یہ طے کر رکھنا چاہیے کہ جنگ کے دوران میں حکومت کی کارروائیوں کا مرکز کہاں ہوگا، قومی سطح پر لڑائی سے متعلق کارروائیوں کی رہ نمائی کون کرے گا اور بّری فوج کے سپہ سالار کا قیام عموماً کہاں رہے گا؟ ان سب باتوں کا فیصلہ اس لیے ضروری ہے کہ آج کل کی جنگ میں رہ نمائی اور نگرانی مواصلات کے ایک انتہائی پیچیدہ نظام کے بغیر ممکن نہیں۔ اِس نظام کا ڈھانچا کافی رقم خرچ کر کے امن کے زمانے ہی میں قائم کیا جاتا ہے۔

میں نے یہ بھی واضح کیا کہ فوج کے مرکز (Headquarters) پر جو عملہ ہوتا ہے وہ گویا اپنے سربراہ کے دماغ ہی کے ایک توسیعی حصّے کی طرح کام کرتا ہے، اور اس دماغ کی صحیح کارکردگی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جن اجزا اور اعضا کی نگرانی ایک کمانڈر کے سپرد ہے اُن سے اُس کے رابطے کا نظام مؤثر اور تیز رفتار ہو۔ فوج کے مرکز اور میدانِ جنگ میں اس کے دستوں کے درمیان مواصلات کا یہ نظام اکہرے تاروں کا کوئی معمولی سلسلہ نہیں ہوتا۔ یہ ریڈیو اور ٹیلیفون کے حلقوں کا ایک پیچ در پیچ جال ہوتا ہے جو حربی تدبیر و عمل (Operations) اور فوجوں کی نقل و حرکت (Logistics) سے متعلق مختلف افراد کے درمیان رابطہ قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ تینوں فوجوں کے سربراہوں کا نہ صرف آپس میں بلکہ اپنے اپنے عملوں سے بھی مستقل رابطہ رہے۔ اِس کے علاوہ اِن سربراہوں کا اُس شخص یا شخصیتوں سے رابطہ بھی ضروری ہوتا ہے جو اعلیٰ ترین سطح پر جنگ سے متعلق تمام مساعی کے نگراں اور انھیں مرتب اور مربوط کرنے کے ذمہ دار ہوں۔

یہ سب باتیں ابتدائی نوعیت کی ہیں اور جو شخص جدید جنگ و جدل کے تقاضوں سے معمولی سی بھی واقفیت رکھتا ہو اُسے اِن کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ لہٰذا جب مجھ سے اُس اجلاس میں یہ پوچھا گیا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے یہ طے کرنا کیوں لازم ہے کہ اُس کی نگرانی کہاں سے ہوگی، تو مجھے قدرے تعجب ہوا جب میں نے وضاحت سے بات سمجھائی تو ایوب خاں نے فرمایا کہ وہ خود میدانِ جنگ سے براہِ راست فوجوں کی رہنمائی کریں گے۔ ازراہِ وضاحت اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جنگ کے دوران میں یقیناً وہ راولپنڈی سے باہر ہوں گے۔ بّری فوج کے سپہ سالار جنرل

موسیٰ نے، جو ایوب خاں کے اتباع میں دیر نہ کرتے تھے، اُس پر گرہ لگائی کہ جنگ کے موقع پر وہ ہرگز جنرل ہیڈ کوارٹرز میں نہ پائے جائیں گے بلکہ میدان جنگ میں کور کی کارروائیوں کی قیادت کریں گے۔ یہ عجیب و غریب باتیں تھیں، اور کسی معمولی شخص کی زبان سے سنی جاتیں تو تفنّنِ طبع کا سامان ہوتیں، لیکن مصیبت یہ تھی کہ اُس موقع پر جو حضرات یہ مضحکہ خیز باتیں کر رہے تھے وہ ملک کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ لہٰذا میں نے بات یہیں ختم نہ کی اور کہا کہ غالباً صدر مملکت خود زیادہ دیر میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکیں گے اور اُن کی دوسری اہم ذمے داریاں ان کو زیادہ تر دارالحکومت میں قیام پر مجبور کر دیں گی۔ جنگ میں حکومت کے سربراہ کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ جنگ سے متعلق جملہ مساعی کو مربوط کرے، حربی صورتِ حال کا لمحہ بہ لمحہ اندازہ کرے، ملک کے تمام وسائل کو جنگ کے لیے مجتمع و منظم کرے اور عام شہریوں کے حوصلے بلند رکھے۔ اِن سب اور دوسرے اہم فرائض بخوبی انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ حکومت کے مرکز میں قیام کرے۔ اسی طرح میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ برّی فوج کے سپہ سالار کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ جنوب میں سندھ سے لے کر شمال میں بلتستان تک جنگی تدبیرِ عمل اور نقل و حرکت میں فوج کی رہنمائی اور نگرانی کرے۔ اِس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے برّی دفاع، اور چترال سے لے کر بلوچستان کے ساحل تک شمال مغربی سرحدوں کی حفاظت کی ذِمہ داری بھی فوج کے سپہ سالار ہی پر ہے۔ اِس لیے یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹرز سے دور رہ کر آخر یہ فرائض کس طرح انجام دے سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ میرے خیال میں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنے

کور کمانڈر کے سر پر سوار رہے۔ ہاں اگر کور کمانڈر نااہل ہے تو بات دوسری ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے جو کچھ اس اعلیٰ سطح کے اجلاس میں سُنا اُس سے ظاہر ہوا کہ یہ حضرات جنگ میں رہنمائی اور قیادت کے اس بنیادی مسئلے تک کو نہیں سمجھتے۔ بے خبری کا یہ عالم دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

میں نے اس کے بعد دُو مرتبہ ایوب خاں کی زیر صدارت فوجوں کے سربراہوں کے اجلاس میں پھر اس مسئلے پر بحث چھیڑی، لیکن دوسروں کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکا۔ تاہم میں نے فضائیہ میں جنگ کے لیے منصوبہ بندی اِس مفروضے کی بنا پر کی کہ اُن اجلاسوں میں جو کچھ طے کیا گیا تھا اُس کے برعکس جنگی کارروائیوں کی نگرانی دارالحکومت ہی سے ہوگی۔ اور صدرِ مملکت میدانِ جنگ میں رہنمائی کے فرائض انجام نہ دیں گے۔ چنانچہ فضائیہ نے اپنے مواصلات کے سلسلے کی تنظیم اسی مفروضے کی بناء پر شروع کی۔ جب یہ فرض کر لیا گیا کہ صدر مملکت اور برّی فوج کے سپہ سالار راولپنڈی ہی میں رہیں گے تو یہ لازم سمجھا گیا کہ فضائیہ کا سربراہ بھی وہیں رہے۔ جنگ میں فضائی فوج کو مختلف قسم کے فرائض انجام دینا پڑتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس کا سربراہ، افواج کے سپہ سالار اعظم (Supreme Commander) کے قریب موجود رہے تاکہ جنگی کارروائیوں میں فضائیہ کے استعمال کے متعلق اُسے مطلع رکھا جا سکے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور یہ اطلاعات بروقت حاصل نہ ہو سکیں تو گڑبڑ کا اندیشہ رہے گا۔ عین ممکن ہے کہ فضائیہ کی خدمات کے لیے جو مختلف مطالبات ہوں اُن کے باعث اُن کا غلط استعمال ہو اور اس طرح اُس کی قوّت ضائع ہو۔ اور جہاں فضائیہ کی قوّت پہلے ہی محدود ہو وہاں اُس کے بے جا استعمال

کے نتائج سنگین ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری سمجھا گیا کہ جنگ کی صورت میں ایئر ہیڈ کوارٹرز کا وہ حصّہ جو جنگی تدبیر و عمل (Operations) کا ذِمہ دار ہے، راولپنڈی میں کام کرے۔ اِس فیصلے کے مطابق ایئر فورس نے مناسب انتظامات کیئے اور مواصلات کا ایک مکمل نظام قائم کیا۔ چنانچہ جب لڑائی چھڑی تو فضائیہ نے جس کا مستقل مرکز پشاور میں تھا، راولپنڈی میں اپنے عملی مرکز سے آسانی کے ساتھ اور موثر طور پر اپنے فرائض انجام دیے۔ جنگ سے بہت پہلے، اُس سلسلۂ مواصلات کا جو فضائیہ کے مرکز اور اُس کے مختلف دستوں کے درمیان، اور اُس کے اور بّری اور بحری افواج کے درمیان قائم کیا گیا تھا، اِمتحان بھی کیا جا چکا تھا اور اسے انتہائی موثر کارکردگی کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔ جنگ شروع ہونے کے بعد فضائیہ نے تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال میں جس رفتار سے کارروائی کی وہ بہت کچھ اُس تیاری کا نتیجہ تھی جو مواصلات کے شعبے میں بہت پہلے کی جا چکی تھی۔

جیسا میرا اندازہ تھا، لڑائی کے سترہ دنوں کے دوران ایوّب خاں نے ایک روز بھی راولپنڈی سے باہر قدم نہ رکھا۔ اور جنرل موسیٰ کا سفر اپنے مکان دفتر اور جی۔ ایچ۔ کیو کے نقل و حرکت کے مرکز (Operations Room) تک محدود رہا۔ ایک دفعہ انھوں نے کور ہیڈ کوارٹر کا دورہ البتہ کیا، لیکن اس کے سوا وہ میدانِ جنگ کی سمت ایوّب پارک میں ایوانِ صدر سے آگے نہ بڑھے جہاں وہ کبھی کبھی ایوّب خاں سے ملاقات کے لیے جاتے رہے۔ بّری ضرب و حرب میں رہ نمائی اور نگرانی تمام تر بریگیڈیر گل حسن اور بلگرامی نے کی۔ توپ خانے کے ایک لفٹیننٹ کرنل نے ان دو افسروں کی

مدد کی۔ اعلیٰ کمان کی طرف سے رہنمائی عملاً مفقود تھی اور جو ہدایتیں آتی تھیں وہ بھی عموماً سلبی اور امتناعی (negative) نوعیت کی ہوتی تھیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر ان افسروں کی کارکردگی بے شک قابلِ داد ہے۔ میدانِ کارزار میں فوجوں کو جو کچھ رہنمائی اور ہدایت حاصل ہو سکی وہ زیادہ تر انھیں افسروں کی پیش دستی کے باعث تھی۔ اُن کی کارگزاری اس لیے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کہ انھیں اپنے مشکل فرائض کی انجام دہی میں بڑی حوصلہ شکن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس مصیبت میں وہ اکیلے نہ تھے۔ فوجی کمان کی اعلیٰ ترین سطح پر رہنمائی اور قیادت کا جو فقدان تھا اُس کا اثر نیچے تک پہنچا تھا اور اس نے ہر سطح پر افسروں میں محرومی کا احساس پیدا کیا تھا۔

ایک عرصے سے ہماری فوج میں کمانڈروں کے انتخاب کا معیار بہت گر چکا تھا۔ اہلیت اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے افسروں کے مقابلے میں انھیں ترجیح دی جاتی رہی تھی جو محض واجبی صلاحیتیں رکھتے تھے لیکن زبانی جمع خرچ میں پکے تھے۔ فوج کی کارگزاری پر اس پست معیارِ انتخاب کا اثر پڑنا ناگزیر تھا اور یہ اثر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پوری طرح رونما ہوا۔ اعلیٰ عہدوں کے لیے صحیح انتخاب کسی فوج کی حربی صلاحیت اور ملکی دفاع کے نقطۂ نظر سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اور اُس پر اظہارِ خیال کے لیے اگر میں اپنے اصل موضوعِ بیان سے تھوڑا سا گریز کروں تو بیجا نہ ہوگا۔

ساتواں باب

فضائی فوج میں اپنی خدمت کے اوائل میں مجھے یکے بعد دیگرے کئی ایسے کمانڈروں کے ماتحت کام کرنے کا اتفاق ہوا جن کی اہلیت واجبی تھی۔ اُن میں سے بعض کو ہوا بازی کا ذوق ہی نہ تھا اور بعض قائدانہ صلاحیت سے محروم تھے۔ ہاں اُن میں ایک افسر البتہ لیاقت میں ممتاز تھا، یہ ہندوستانی فضائیہ کا اسکواڈرن لیڈر مہر سنگھ تھا جو بعد میں ایئر کموڈور کے رُتبے کو پہنچا۔ لائق افسروں کی اِس کمی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں میں ایک محرومی کا احساس اور بیزاری کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ہمیں یہ سارا کاروبار کچھ تماشا سا معلوم ہونے لگا۔ پھر جب ہمارے اسکواڈرن نے برما میں جاپانیوں کے خلاف کارروائی میں حصّہ لیا تو اس کی بدنامی ہوئی کیونکہ اسکواڈرن کا سربراہ، جو رائل ایئر فورس کا ایک ریزرو (reserve) افسر تھا، نہایت نااہل ثابت ہوا۔ اس سے نوجوان افسروں میں بیزاری اور تنفر کی جگہ غصّہ

پیدا ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایئر ہیڈ کوارٹرز کی اعلیٰ کمان نے افسروں کا انتخاب سمجھ بوجھ سے نہ کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ افواج کے اعلیٰ افسر، جن کے پاس فیصلے کرنے کے اختیارات ہوتے ہیں، عموماً بہت مصروف رہتے ہیں اور عملے کے صحیح انتخاب کے لیے کافی وقت نہیں نکال سکتے حالانکہ یہ کام فوج کی کارکردگی کے نقطۂ نظر سے انتہائی اہم ہے۔ عام طور پر وہ اِس ضمن میں اپنے ماتحتوں کے مشورے پر انحصار کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انتخاب عملاً ایسے افسر کرتے ہیں جو خود کوئی غیر معمولی اہلیت نہیں رکھتے۔ اِن میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو صحت کے مطلوبہ معیار پر پورے نہ اُترنے کے باعث اعلیٰ کمان کے اہل نہ رہے ہوں یا کسی اور وجہ سے اُس کے لیے موزوں نہ سمجھے جاتے ہوں۔ ایسے افسروں کا رویّہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ امیدواروں میں قائدانہ صلاحیتیں تلاش کرنے کے بجائے سب سے سہل راستہ اختیار کرتے ہیں اور اعلیٰ رُتبوں پر ترقی کے لیے اتنی اہلیت کافی سمجھتے ہیں کہ امیدوار کے سرکاری اعمال نامے میں اس کے خلاف کوئی اندراج نہ پایا جائے۔ انتخاب کے اِس ناقص طریقے کا مشاہدہ میں بارہا کر چکا تھا اور یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ اُس کی وجہ سے فضائیہ کی عملی صلاحیت پر بہت بُرا اثر پڑا تھا۔ اور میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اگر میں کبھی کسی ایسے منصب پر پہنچا جہاں مجھے فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں تو میں اِس طریقہ انتخاب کو ہرگز نہ چلنے دوں گا۔ اس کے بعد سے فضائیہ کی خدمت میں جو مزید تجربہ مجھے حاصل ہوا اس سے میری رائے کی تصدیق ہوتی رہی۔

فضائی فوج متعدد اسٹیشنوں (Stations) یا اڈوں (Bases) میں منقسم ہوتی ہے۔ اڈے کا سربراہ، عموماً کمانڈر کہلاتا ہے اس کی شخصیت اور ذاتی خوبیوں کا اُس کے ماتحت دستے پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ سپہ سالار تو دور کہیں اپنے ہیڈکوارٹر میں رہتا ہے، اڈّے کے افسروں کو روزمرہ واسطہ اُس سے نہیں بلکہ اپنے اڈّہ کے کمانڈر سے رہتا ہے اور اس کے طرزِ عمل اور رویئے کا اثر لازماً اُن سب پر پڑتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ بھی اُسی کے اندازِ فکر اور ذہنیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ میری یہ پکّی رائے تھی کہ فضائیہ کا معیار اِن دس بارہ کمانڈروں کی صلاحیتوں اور کارگزاری پر منحصر ہوتا ہے۔ اِس کے بعد نہایت اہم، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ سب سے زیادہ اہم، انتخاب اسکواڈرن کمانڈروں کا ہوتا ہے، کیوں کہ لڑنے والے دستوں کی کمان اُنہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کسی چھوٹی فضائی فوج میں اِن افسروں کی کُل تعداد تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ اور اِسی مناسبت سے اُن کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ میری رائے میں یہ ضروری ہے کہ اِن کمانڈروں کا معیار اپنے اپنے دائرہ کار میں اوسط سے اُونچا ہونا چاہیئے۔ میں اُن کی بعض انسانی کمزوریوں سے چشم پوشی کرنے کو تیار تھا، بشرطیکہ فضا میں اُن کی کارگزاری اِس معیار کی ہو کہ انھیں اپنے عملے کا اعتماد اور احترام حاصل ہو۔ اُن کی فنّی صلاحیت بے داغ ہونی چاہیے اور اِس ضمن میں اُنھیں اپنے زیرِ قیادت افسروں پر نمایاں برتری حاصل ہونی چاہیے۔ ان افسروں کی نظر میں اسکواڈرن کمانڈر کے لیے

یہ خوبیاں نہایت ضروری ہیں اور کوئی دوسری خوبی اُن کا بدل نہیں ہوسکتی۔ لہذا جب اعلیٰ کمان میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے خود نہایت احتیاط سے اُن عہدوں کے لیے مناسب افسروں کا اِنتخاب کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں بعض مرتبہ سینئیر افسروں کے مقابلے میں جونیئر افسروں کو منتخب کرنا پڑا۔ اِس طرح کا انتخاب کبھی خوشگوار نہیں ہوتا، لیکن یہی عمل اگر نیک نیتی اور بے تعصبی سے کیا جائے تو لوگ اُ سے خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اگر تمام انتخاب اِسی اُصول پر کیے جائیں اور اُن میں کوئی اور اثر قبول نہ کیا جائے تو کچھ عرصے میں پوری فوج اس طریقے کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیتی ہے۔ اس عملِ انتخاب میں جو سینئیر افسر رہ جاتا ہے اُس سے ہمدردی کرنے والے تو کچھ ضرور ہوتے ہیں، لیکن اگر منتخب افسر اپنی صلاحیتوں میں واقعی ممتاز ہو تو سب یہ مان لیتے ہیں کہ اِسے اپنی فنّی برتری کی بنا پر ترجیح دی گئی ہے حتّٰی کہ وہ افسر بھی جس پر اُسے ترجیح دی گئی ہے، دل میں حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے چاہے وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرے۔ اگر اس کے مدِّمقابل کی فوقیت ظاہر ہو، اور اس میں بھی کوئی شبہہ نہ ہو کہ تمام انتخابوں کے لیے یہی ایک معیار ہے، تو وہ شکایت بھی شاید ہی کرے۔ ہاں، اگر افسروں کے تقدّم (Seniority) کو نظر انداز کر کے ایسوں کو ترجیح دی جائے جو اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتے تو ظاہر ہے کہ اس سے بے اطمینانی پیدا ہو گی اور حق داروں کی ہمت شکنی ہو گی۔

کمانڈروں کے انتخاب کا یہ معیار فضائیہ کی طرح دوسری افواج کے لیئے بھی نہایت اہم ہے جس طرح فضائیہ کی کارکردگی کا انحصار زیادہ تر اُس کے

اسکواڈرن کمانڈروں کی صلاحیت پر ہوتا ہے اِسی طرح برّی فوج کو کامیابی کے لیئے لائق اور مستعد ڈویژن، برگیڈ اور بٹالین کمانڈروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ گھٹیا درجے کے ہوں تو فوج بہ حیثیت مجموعی کبھی مضبوط نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلے کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے جس کا ذکر اس باب کے آغاز میں ہو چکا ہے اگر اعلیٰ کمانڈروں کا انتخاب صحیح ہو تو باقی نظام بھی خود بخود ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ مثلاً اگر کور اور ڈویژن کے کمانڈروں کا انتخاب معیاری ہو تو سمجھیئے کہ اچھّی اور مضبوط فوج کی ضمانت مل گئی۔ اگر کمانڈر لائق ہو تو وہ اپنے زیرِ قیادت دستوں میں بھی کسی قسم کی نا اہلی برداشت نہ کرے گا۔ وہ اپنے ماتحتوں میں اُن صلاحیتوں خوبیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے گا جنھیں وہ اہم سمجھتا ہے، اور نا اہل افراد کو برخاست کرنے کا بروقت اہتمام کرے گا۔ وہ دوسروں میں اہلیت اور لیاقت کا صحیح اندازہ کر سکے گا اور جلد ہی اُس کی اپنی شخصیت اور رَوّیے کا اظہار اُس کے معیارِ انتخاب میں ہونے لگے گا۔

اِس کے برعکس اگر کمانڈر خود نا اہل ہو تو صورت کیا ہوگی؟ اُس کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے مقابلے میں، ذہنی یا فنّی صلاحیتوں میں کم تر ظاہر نہ ہو۔ فوجی انتظام کے روزمرہ کے معاملات میں، مذاکروں اور مباحثوں میں، اور جنگی مشقوں میں، اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جب اعلیٰ صلاحیت، جس افسر میں بھی ہو، خود بخود نمایاں ہو جاتی ہے، خواہ اِسے دبانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ اب اگر کمانڈر کا کوئی ماتحت افسر اُس سے زیادہ لائق ہو اور اُس کی یہ برتری اکثر ظاہر

ہوتی رہے اور اُس کا اعتراف عام ہو جائے تو کمانڈر کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر اپنے اس لائق ماتحت سے چھٹکارا حاصل کر لے گا، تاکہ خود اُس کی دانائی اور لیاقت پر کوئی حرف نہ آنے پائے اور تمام عملہ اسی کی رہ نمائی اور ہدایت کو حرفِ آخر سمجھتا رہے۔ بہرحال چونکہ دوسرے لوگ ایسے ذہین افسروں کی ذہانت کے معترف ہوتے ہیں اِس لیئے اُن میں کوئی ایسا نقص تلاش کر لیا جاتا ہے جس کی آڑ میں یہ کہا جا سکے کہ وہ فوج کی خدمت میں زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے اندازے کسی شعوری بدنیتی سے قائم نہیں کیے جاتے بلکہ کمانڈر واقعی اپنے تئیں یہ سمجھتا ہے کہ اس کی رائے سچی ہے۔ مثلاً اگر کسی افسر کو اس کے خیالات یا نقطہ نظر سے اختلاف ہے تو وہ اُس کی وفاداری پر شک کرنے لگتا ہے۔ اگر افسر کے خیالات اُسے غیر معمولی معلوم ہوتے ہیں تو وہ اُس کے ذہن کو ناپختہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے سے بالا افسروں کے احکام کی تعمیل حرف بحرف نہیں کرتا تو اُسے ناقابلِ اعتبار خیال کرتا ہے، خواہ تعمیل میں اس نے کوئی بہتر مقصد کیوں نہ حاصل کر لیا ہو۔ ایسی غیر معمولی ذہانت رکھنے والے افسروں پر حکّام بالا اکثر بے جا تنقید بھی کرتے رہتے ہیں۔ جہاں افسر بالا میں اپنے ماتحت کے مقابلے میں ذہانت یا فنّی مہارت کم تر ہو وہاں یہ عیب جوئی ایک حد تک فطری ہوتی ہے۔ پھر اس کے علاوہ عام بشری کمزوریاں، مثلاً خوشامد پسندی اور ذاتی وفاداری کی بیجا توقع بھی کمانڈر کی نظر کو دھندلا دیتی ہیں اور اس کی رائے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ با ایں ہمہ چونکہ فوج کی جنگی صلاحیتوں کا دارومدار انسانی مہارت اور قوّتِ اختراع پر ہوتا ہے، اس لیے میں صحیح انتخاب کی صلاحیت کو ایک کمانڈر کی سب سے بڑی خوبی سمجھتا ہوں۔

آٹھواں باب

پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات کے معاملے میں صدر ایوّب کا رویہ ہمیشہ نہایت محتاط رہا تھا، اور ہندوستان سے رابطوں کے بارے میں یہ احتیاط خاص طور پر نمایاں تھی۔ اِس لیے مجھے یقین نہ آتا تھا کہ انھوں نے ایک ایسی حکمت عملی منظور کرلی ہے جس میں ہندوستان سے ایک بھرپور جنگ کا سامان پوشیدہ ہے۔ اگست ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں ہم نے اخباروں میں پڑھا کہ آزاد کشمیر کے رضاکار جنگ بندی کی لائن توڑ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب ان حملوں کی شدّت بڑھنے لگی تو یہ ظاہر ہوگیا کہ کشمیر کے معاملے میں ہماری پالیسی میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

اس سے صرف چند مہینے پہلے تک صورت اس کے برعکس تھی۔ جب کبھی

ایوب خاں کے سامنے یہ تجویز کیا گیا کہ پاکستان کشمیر میں کوئی پیش قدمی کرے اور اس میں جو خطرہ ہے اس کے مقابلے کے لیے تیار رہے تو انھوں نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ اس لیے جب آزاد کشمیر سے رضا کاروں نے جنگ بندی لائن کو پار کرنا شروع کیا تو یہ سوال لازماً ذہنوں میں اُبھرا کہ ایوب خاں کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی کیونکر واقع ہوئی۔

دوسرے پاکستانیوں کی طرح ایوب خاں بھی کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویے پر برانگیختہ تھے، لیکن اپنے ہم وطنوں میں سب سے زیادہ وہ اس کے قائل تھے کہ اس قضیے کا کوئی پُرامن حل تلاش کرنا چاہیے۔ ہندوستان سے سلسلہ جنبانی جس کی انتہا پنڈت نہرو سے ان کی ۱۹۶۰ء کی ملاقات تھی بے سود ثابت ہوئی تو ان کو سخت مایوسی ہوئی۔ اسی اثنا میں ان کے خیالات پر بعض بین الاقوامی واقعات کا بتدریج اثر ہوا جو بالآخر گہرا اور دور رس ثابت ہوا۔ الجزائر میں عوام کی مجاہدانہ جنگِ آزادی نے بالآخر فرانس کو شمالی افریقہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ویت نام کی جنگ اور ملیشیا کے خلاف انڈونیشیا کی محاذ آرائی سے بھی اُن کا ذہن متاثر ہوا۔ ویت نام میں امریکہ فوجی طاقت کے بل پر کامیابی حاصل نہ کر سکا تھا۔ دوسری طرف انڈونیشیا نے برطانیہ کو جنوب مشرقی ایشیا میں پریشان کن حد تک ملوث کر دیا تھا۔ اِن حالات سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر کسی قومی تحریک کی صحیح طرز پر رہ نمائی ہو تو اُس میں غیر ملکی قوتوں کے خلاف کتنی زبردست طاقت بروئے کار لائی جا سکتی ہے۔

پھر ۱۹۶۵ء کے موسمِ بہار میں رن کچھ کے میدان میں پاکستانی اور ہندوستانی

فوجوں میں جھڑپیں ہوئیں اور اُن میں پاکستان کی کامیابی سے ایوّب خاں کے بڑھتے ہوئے اعتماد میں مزید اضافہ ہوا۔ رن کچھ کی لڑائی کے نتیجے میں جنرل موسیٰ کی ہمّت بھی بڑھ گئی اور جیسے جیسے ہماری افواج کی برتری پر ایوّب خاں کا اعتماد بڑھتا گیا اسی مناسبت سے برّی فوج کی قوّت کے متعلق جنرل موسیٰ کا اندازہ بھی بدلتا رہا۔ رن کچھ میں ہماری کامیابی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض پرلے درجے کے خوشامدیوں کو اپنے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملا۔ پھر بعض نیک نیت مبصر بھی تھے جنھیں ملک کی فوج کے کارناموں پر واقعی فخر تھا اور وہ جہاں بھی موقع ہوتا اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اخبارات نے بھی فوج کی کامیابی کی جس طرح تشہیر کی اُس سے بھی ایسا سماں پیدا ہوا گویا قوم کو ایک عظیم فتح نصیب ہوئی ہے اور اُس کی فوج ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس فضا کا اثر ہمہ گیر تھا اور موسیٰ کی جگہ کوئی اوسط درجہ کا شخص بھی فوج کا سربراہ ہوتا تو اُس سے فطرتاً متاثر ہوتا، پھر موسیٰ کا تو کہنا ہی کیا۔ اب نہ صرف فوج کی صلاحیت بلکہ اُن کی اپنی لیاقت پر بھی اُن کا اعتماد بڑھ گیا اور انھوں نے اس کا مظاہرہ بھی شروع کر دیا۔ اُدھر دفترِ خارجہ نے جب یہ محسوس کیا کہ صدر ایوّب بھی ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں اور اُن کا میلان بھی اِسی جانب ہے کہ ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ جرأت مندانہ اقدامات کرنے چاہئیں۔ تو اس نے بھی زیادہ سخت روّیہ اختیار کیا۔ اعلیٰ سول حکام نے بھی اس نقطہٴ نظر کی حمایت کی اور جی۔ ایچ۔ کیو کو فوجی کارروائی کا منصوبہ بنانے پر آمادہ کیا گیا۔ یہ کام میجر جنرل اختر حسین ملک کے سُپرد کیا گیا جو اُس وقت بارھویں ڈِویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے اور اس حیثیت سے آزاد کشمیر کے دفاع کے

بھی ذمے دار تھے۔ وہ ایک جری افسر تھے اور ان کی قوّتِ متخیلہ بھی تیز تھی۔ انھوں نے جو منصوبہ تیار کیا وہ اُن کی شخصیت اور اندازِ فکر کا آئینہ دار تھا، اور اُسے عملِ جبل الطارق (Operation Gibraltar) کا فوجی نام دیا گیا۔ صدر ایوّب نے اُسے منظور کیا تو اُن کے اعلیٰ سول مشیروں نے اِس کا خیر مقدم کیا۔ موسیٰ نے جب دیکھا کہ صدر کا رُخ اس طرف ہے تو انھوں نے بھی منصوبہ کی پوری طرح حمایت کی، حالاں کہ اُن کا طبعی میلان اور فوجی کمانڈر کی حیثیت سے اُن کی رائے اُس کے خلاف تھی۔

کشمیر میں فوجی اقدام کا یہ فیصلہ تین مفروضوں پر مبنی تھا۔ ایک یہ کہ چھاپہ مار لڑائی میں کامیابی کے لیے جو وسیع عوامی حمایت لازمی ہوتی ہے وہ مقبوضہ کشمیر میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کارروائی کے جواب میں آزاد کشمیر پر ہندوستان کے فوجی حملے کا خطرہ بعید از قیاس ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کا بالکل کوئی اندیشہ نہیں کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد توڑ کر مغربی یا مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے گا۔

حقیقت میں صورتِ حال اس سے بہت مختلف تھی۔ اِس میں تو شک نہیں کہ کشمیر کے عوام بکثرت پاکستان کے حق میں تھے۔ تاہم یہ اُمید کرنا بجا نہ تھا کہ ہندوستان کے خلاف اُن میں جو غم و غصّہ ہے اسے چند دنوں میں منظم کر کے حرکت میں لایا جا سکتا ہے اور ہندوستان کی صفوں کے عقب میں وسیع پیمانے کی کارروائیوں کے لیئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشکل یہ بھی پیدا ہوئی کہ اس کارروائی کے لیے جو عملہ منتخب کیا گیا وہ نہ مقبوضہ علاقے کے جغرافیہ سے واقف تھا نہ اُس کے

عوام کی زبان سے۔ پھر منصوبہ جتنی عجلت میں تیار کیا گیا تھا اُسی قدر عجلت میں اس پر عمل در آمد شروع کر دیا گیا۔ ان نامساعد حالات اور خامیوں کے باوجود اس پیش قدمی میں جو کامیابی پاکستان کو حاصل ہوئی وہ واقعی تعجب خیز ہے کیونکہ نہ تو منصوبہ پر عمل کرتے وقت اس کی رفتار کو بتدریج بڑھایا گیا کہ وہ ایک عوامی بغاوت ظاہر ہو نہ فوجی کارروائی کو اس طرح قابو میں رکھا گیا کہ وہ ہندوستان کے لیے سیاسی یا فوجی نقطۂ نظر سے قابلِ برداشت رہے۔ چنانچہ جب حملہ آوروں کی پیش قدمی کی شدت اور وسعت اس تیزی سے بڑھنے لگی کہ کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ خطرے میں پڑ گیا تو اس کی فوج کی اعلیٰ کمان نے اپنی حکومت کو جوابی کارروائی پر آمادہ کیا۔ اس کارروائی کے لیے ہندوستانیوں نے آزاد کشمیر کے اُس علاقے کا انتخاب کیا جو جنگی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت رکھتا تھا کہ اس میں فتح حاصل کر کے وہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتے تھے اور پاکستانی فوج کے لیے ناموافق صورتِ حال پیدا کر سکتے تھے۔ یہ علاقہ حاجی پیر کا درہ (Salient) تھا جو پاکستان کے لیے آزاد کشمیر کے شمالی اور جنوبی علاقوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ ۲۴ اگست کو ہندوستانیوں نے اِس علاقے میں آزاد کشمیر کی فوج کے ٹھکانوں پر سخت حملہ کیا۔ اِن ٹھکانوں کی حفاظت کے لیے زیادہ فوج موجود نہ تھی اور ۲۸ اگست تک ہندوستانیوں نے اتنے بڑے رقبے پر قبضہ کر لیا تھا کہ وہ آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد اور جنوب میں اُس کے ایک اہم مواصلاتی مرکز کوٹلی کے درمیان آمد و رفت اور مواصلات کے سب سے مختصر رستے کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئے۔

درّہ حاجی پیر پر حملہ اٹھارہ سال میں پہلا منظم فوجی حملہ اور جنگ بندی لائن کی خلاف ورزی تھا۔ جس سے کشمیر کی لڑائی میں ایک نئی وسعت پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد پاکستان اس پر مجبور ہوگیا کہ وہ ایسے علاقے میں جوابی کارروائی کرے جہاں ہندوستان کا دفاعی نظام مضبوط نہ ہو اور نسبتاً کم فوجی قوّت صرف کرکے کوئی فیصلہ کن کامیابی حاصل کی جاسکے۔ چنانچہ حملے کے لیے چھمب اور اکھنور کا علاقہ منتخب کیا گیا جس میں بکتر بند فوج کام میں لائی جاسکتی تھی اور جسے ایک ایسے اڈے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا جہاں سے جموں اور سرینگر کے درمیان کی سڑک ہماری فوج کی زد میں ہو۔ یہ سڑک ہندوستان اور وادیٔ کشمیر کے درمیان رابطے میں شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا پیدل فوج کے ساتویں ڈویژن کو جو لاہور کے جنوب میں مقیم تھا، چھمب کو کوچ کرنے کا حکم ملا۔ اور حملے کے آغاز کا کام ایک بریگیڈ کے سپرد تھا جو بارھویں ڈویژن کے ماتحت تھا۔ اور جس کے کمانڈر میجر جنرل اختر حسین ملک تھے۔

ساتویں ڈویژن کو لاہور کے جنوب سے، منتقل کرنے کا فیصلہ نہایت اہم تھا اور اس کے نتائج دور رس تھے۔ پاکستانی فوج کا جوابی حملہ کرنے والا حصّہ اس ڈویژن اور پہلے بکتر بند ڈویژن پر مشتمل تھا اور اسی میں ہماری فوج کی اصل قوّتِ حرب مرکوز تھی، ساتویں ڈویژن کو اس کے مرکزی علاقے سے ہٹانے کا مطلب صرف یہ ہوسکتا تھا کہ اُس ڈویژن کے ہندوستان کے خلاف لڑائی میں استعمال کا امکان بہت کم ہے اور اگر وہ استعمال ہوا بھی تو اُس وقت ہوگا۔ جب وہ اپنے مرکز واپس آچکا ہوگا۔

میدانِ جنگ میں صورت یہ تھی کہ جب بارھویں ڈویژن کے دستے تیزی سے اکھنور کی جانب بڑھنے لگے تو ہندوستان مشکل میں پڑ گیا۔ جیسے پاکستان کو حاجی پیر کے درّے پر حملے کی توقع نہ تھی اُسی طرح ہندوستانیوں کو یہ خیال نہ تھا کہ چھمب اور اکھنور کے حلقے میں پاکستان اِتنا بھاری حملہ کر دے گا۔ یہ حملہ نہ صرف اچانک ہوا بلکہ اِس میں ٹینک اور بھاری توپ خانہ بھی استعمال ہوئے۔ اس سے پہلے کشمیر کی لڑائی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کی ابتدائی کامیابیوں سے جمّوں اور تمام مقبوضہ کشمیر میں دہشت پھیل گئی اور سارے ہندوستان کو دھچکا لگا اور تعجب ہوا۔ اب اگر پاکستان اکھنور پر بھی قبضہ کر لیتا تو ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان سلسلۂ مواصلات خطرے میں پڑ جاتا اور یہ خطرہ بھی پیدا ہو جاتا کہ ہندوستان کی فوج کا ایک بڑا حصّہ شمالی اور وسطی کشمیر میں ضائع ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ہندوستانی فوج کے حوصلوں پر تباہ کُن اثر پڑتا اور ملک بھر میں پاکستان کا مقابلہ کرنے کے عزم کو سخت دھچکا لگتا ہندوستان کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ یہ نوبت نہ آنے پائے اور اُس کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنے اہم فوجی علاقوں کو اس خطرے سے بچائے۔ چنانچہ اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ میدانِ جنگ کو آزاد کشمیر تک محدود رکھنے کے بجائے مغربی پاکستان میں پھیلا دے۔

مغربی پاکستان پر حملے کے آغاز کے لیے لاہور کو ہدف بنایا گیا، قدرتی طور پر ان کے پاس اس سے بہتر انتخاب نہ تھا۔ لاہور مواصلات کا ایک بڑا مرکز ہے اور سیاسی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے مغربی پاکستان کا سب سے اہم شہر۔ اُسے ساری قوم کے دل و دماغ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ہندوستانیوں نے یہ صحیح اندازہ لگایا کہ اگر وہ لاہور پر یلغار کر کے اُسے خطرے

میں ڈال دیں تو اُسے بچانے کے لیے پاکستان کو اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ اُس طرف منتقل کرنا پڑے گا اور اس طرح لازماً جموں اور اکھنور پر اُس کی فوجوں کا دباؤ کم ہو جائے گا۔

ہندوستانیوں نے جب پاکستان پر حملہ شروع کیا تو اُن کے سامنے شاید یہی محدود مقصد ہو۔ اُس حملے کے جواب میں جو شدید اور ہمہ گیر ردِّ عمل ہوا اس کے لیے وہ غالباً تیار نہ تھے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ چھ ستمبر کے ابتدائی حملے میں انھوں نے اپنی فضائیہ کو استعمال نہیں کیا تھا، سوائے اس کے کہ وزیر آباد کے قریب ایک مُسافر ریل گاڑی پر حملہ کر دیا۔ فضائیہ کو حملے سے الگ رکھنے کی صرف یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ ان کے پیشِ نظر ایک محدود مقصد تھا اور وہ پاکستان کے خلاف بھرپور اور ملک گیر جنگ شروع کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن جب لاہور پر حملے سے یہ جنگ چھڑ گئی تو انھوں نے اپنے بکتر بند دستے، جو پہلے ہی جموّں اور سیالکوٹ کے علاقے میں منتقل کر دیئے گئے تھے، اُس حملے میں جھونک دیئے جو پاکستان کے خلاف اُن کا سب سے زبردست جارحانہ حملہ ثابت ہوا۔

اِدھر پاکستان میں ساتویں ڈویژن کو چھمب کے علاقے میں منتقل کرنے کی کارروائی دوسری ستمبر کی صبح کو مکمل ہو چکی تھی، یعنی بارہویں ڈویژن کے حملے کے آغاز کے تقریباً ۳۶ گھنٹے بعد۔ اسی دن جنگ کے اس علاقہ کی کمان میجر جنرل یحییٰ خاں کو سونپ دی گئی، جو ساتویں ڈِویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے، اور میجر جنرل اختر ملک کو حکم دیا گیا کہ وہ شمال میں اپنے پُرانے مقام پر واپس چلے جائیں۔ اِس تبدیلی کے بڑے دوررس نتائج ہوئے۔ اُس نے نہ صرف کشمیر میں جنگی کارروائیوں کو، بلکہ ہندوستان

کے خلاف جنگ کے پورے نقشے کو متاثر کیا۔ جنرل اختر ملک کی کمان میں جو علاقہ پہلے تھا، اور جس میں چھمب اور اکھنور کا علاقہ شامل تھا۔ اُس میں جنگی تدبیر و عمل کا سارا منصوبہ اُن ہی نے تیار کیا تھا، اور اُن ہی نے صدرِ مملکت کو اُس طریقِ عمل پر آمادہ کیا تھا جس سے یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تھی۔ اس مقابلہ کی کامیابی یا ناکامی سے اُن کا ذاتی وقار وابستہ تھا۔ اِس کے علاوہ مزاج اور اندازِ فکر کے اعتبار سے وہ اس کارروائی میں فوج کی قیادت کے لیے خصوصاً موزوں تھے، کیونکہ اِس میں غیر معمولی جرآت اور دَم خم کی بڑی ضرورت تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے زیرِ کمان دستے آگے بڑھ رہے تھے اور کارروائی کی رفتار اطمینان بخش تھی۔ اِس کے برعکس یحییٰ خاں اِس سے پہلے فوج کے اُس حصّے سے متعلق تھے جو اِس علاقے سے ڈیڑھ سو میل دور مقیم تھا اور پچھلے کئی مہینوں سے وہ ایک بالکل مختلف کارروائی کے لیے تیاّری کر رہے تھے۔ اِنتظامی نقطۂ نظر سے اور فوجی نقل و حمل کے اعتبار سے، اُن کی چھمب کو منتقلی کے لیے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ضروری تھیں۔ یہ تبدیلیاں بڑی تیز رفتاری سے عمل میں لائی گئیں اور اس سلسلے میں اُن تمام مسائل سے نبٹنا پڑا جو ایسی صورت میں لازماً پیدا ہوتے ہیں جب بڑے فوجی دستے کسی منصوبے بندی کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاتے ہیں۔

الغرض ساتواں ڈِویژن دو تین دن کی مسلسل تیاریوں اور نقل و حرکت کے بعد اپنے نئے ٹھکانے پر پہنچا اور تیسری ستمبر کو وہ دشمن سے دوچار ہوا۔ اِدھر وہ لڑائی میں شریک ہوا اور اُدھر بارہویں ڈویژن کے سربراہ کو بُلا کر آزاد کشمیر میں ان کے ہیڈ کوارٹر واپس بھیج دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اِس نازک موقع پر میدانِ جنگ سے ہٹایا جانا اختر ملک

کو ناگوار گزرا۔ دوسری طرف یحییٰ خاں نے اپنی تعیناتی کو خوش دلی سے قبول نہ کیا۔ کیونکہ انھیں ایک ایسے منصوبے کی تعمیل پر مامور کیا گیا تھا جس کی تشکیل سے اُن کا کوئی واسطہ نہ تھا۔

چھمب کی اہم لڑائی کے دوران کمانڈروں کے ردّ و بدل کا یہ فیصلہ اُسی قدر غیر معقول تھا جتنا وہ فیصلہ جس کی رو سے فوج کے ساتویں ڈویژن کو جنوب میں پنجاب میں فوج کی اصل قوت سے منتقل کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ اس مفروضے پر مبنی تھا کہ اکھنور پر حملے کا جواب دشمن جنوب میں پاکستان کی سرزمین پر نہیں بلکہ شمال میں آزاد کشمیر کے علاقے میں دے گا۔ یہ فیصلہ کسی بھی سیاسی اندازے پر مبنی ہو، فوجی نقطۂ نظر سے بڑی سنگین غلطی تھا، کیونکہ اس طرح ہمارا حملہ کرنے والا صدر لشکر اُس وقت کمزور پڑ گیا جب ہندوستان سے ہمارے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ اور لڑائی کے دوران کامیاب کمانڈر کا میدانِ جنگ سے تبادلہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اربابِ حل و عقد حقیقت شناسی سے قطعاً عاری ہیں۔ فوجی معاملات میں ایسی حقیقت ناشناسی کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

اِدھر پاکستان لڑائی کے دوران اپنے کمانڈر بدل رہا تھا۔ اُدھر ہندوستان نے اکھنور کے علاقے میں اپنے ٹوٹتے ہوئے دفاعی مورچوں کو سہارا دینے کی ایک آخری جان توڑ کوشش شروع کی۔ ہماری طرف دستوں کی تبدیلی کی وجہ سے پیش قدمی کی رفتار اتنی دھیمی پڑ گئی کہ ہندوستانیوں کو اپنے مورچے مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ ۶ ستمبر کو جب دشمن نے پنجاب میں ہماری سرحدوں پر یلغار کی تو اکھنور اور چھمب کے خطّے میں اُن کے گرتے ہوئے حوصلے پھر سنبھلنے لگے۔

اس اثنا میں اندرونِ کشمیر منصوبۂ مجاہد، زور پکڑ گیا تھا۔ پاکستان نے آزادی کی تحریک کی جو اعانت کی تھی اُس سے مقبوضہ کشمیر کے عوام میں نئی اُمیدیں پیدا ہو گئی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان سے بھرپور جنگ نے بالآخر وہ موقع فراہم کر دیا ہے جس کے وہ مدّت سے منتظر تھے لیکن جب ۲۳ ستمبر کو لڑائی بند کر دی گئی تو یہ لوگ، جنھوں نے ناقابلِ بیان تکلیفیں اٹھائی تھیں اور بڑی قربانیاں دی تھیں، اسی طرح بھونچکے رہ گئے جیسے وہ لوگ جنھوں نے اپنی مرضی سے ایک ایسے مقصد کے حصول کے لیئے ہتھیار اُٹھائے تھے جسے وہ مبنی برحق سمجھتے تھے۔ پاکستان کے رضاکار کشمیر چھوڑ کر لوٹ آئے تو مقبوضہ علاقے میں 'مجاہدین'، ہندوستانی فوجوں کے رحم وکرم پر رہ گئے۔ اُن کے گاؤں جلا ڈالے گئے اور اُن کی عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ خود انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ایذائیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔

یوں کشمیر کے بہادر عوام سے ایک ایسی قوم نے بے وفائی کی کہ جس پر انھوں نے کامل اعتماد کیا تھا۔ ایسے مذموم طرزِ عمل کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یہ غالباً پاکستان کی تاریخ کا سب سے تاریک باب ہے جسے یاد کر کے پاکستانی ہمیشہ شرم محسوس کریں گے۔

نواں باب

موجودہ نصف صدی کے اوائل میں جب جنرل ایوب خاں نے پاکستان کے لیے امریکہ کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش شروع کی تو وہاں کے حلقۂ اقتدار میں لوگوں کو گوش برآواز پایا۔ اُس زمانے میں بین الاقوامی معاملات میں امریکہ کا زبردست عمل دخل اور اثر تھا۔ امریکہ کی آزاد خیال اور جمہوریت پسند مملکت کی تاریخی حیثیت کا نقش بہت کچھ ذہنوں پر باقی تھا کیونکہ کیوبا اور ویت نام میں اس کی مداخلت سے اس کی شہرت ابھی داغدار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اُس کی زبردست اور بڑھتی ہوئی فوجی قوّت، جو تاریخ میں بے نظیر تھی اور اُس وقت تک سوویت یونین کی طاقت سے بہت زیادہ تھی، ساری دُنیا میں محسوس کی جا رہی تھی۔

بین الاقوامی اشتراکیت کے خلاف اُس کا "جہاد" شروع ہو چکا تھا اور اُس کے وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلّس کی شخصیت اور مستقل مزاجی اس "جہاد" کی ایک زبردست شخصی علامت بن گئی تھی۔ اِس "جہاد" کی تہ میں ایک حقیقی جذبہ کارفرما معلوم ہوتا تھا اور اُن قوموں نے جو حال ہی میں آزاد ہوئی تھیں عموماً اُس کا اثر قبول کیا۔ ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں اشتراکیت اُس وقت تک نسبتاً غیر معروف تھی اور جب امریکہ کے حکمران اور نمائندے واعظانہ شان سے اِن قوموں کو "ظالم" روسیوں سے خبردار کرتے تو اُن کی گرمیِ گفتار بے اثر نہ رہتی، اگرچہ اِن وعظوں میں کچھ سامان تفنّنِ طبع کا بھی ہوتا تھا۔ چین میں اِنقلاب مکمّل اور اشتراکی نظام قائم ہو چکا تھا، تاہم وہ ملک ابھی اِتنا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ امریکہ کو اُس سے کوئی خطرہ محسوس ہو، حالانکہ ڈلّس اور محکمہ خارجہ نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ آخر میں امریکی مفادات سے چین کا تصادم ضرور ہو گا۔

یہ تھا وہ بین الاقوامی پس منظر جس میں ایوبؔ خاں، جو اُس وقت پاکستان کی برّی فوج کے سپہ سالار تھے، واشنگٹن میں وارد ہوئے وہاں انھوں نے امریکہ کے فوجی وسائل کا جو مشاہدہ کیا، اور سیاسی اور فوجی قائدین سے جو بات چیت کی اُس سے اُنھیں یقین ہو گیا کہ پاکستان کی تقدیر امریکہ کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے اور اُس کے لیے اب اور کوئی راستہ نہیں۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ ہندوستان کے معاندانہ روّیے کے باعث پاکستان کو جو خطرہ لاحق تھا اُس کا مقابلہ صرف ایک ایسے ملک کی مدد اور اعانت سے کیا جا سکتا تھا جس کے پاس وسیع فوجی اور اقتصادی وسائل ہوں۔ اُن کے خیال کے مطابق اِس خطۂ ارض میں استحکام اُسی صورت میں قائم ہو سکتا

تھا کہ برطانیہ کے ہٹ جانے سے بین الاقوامی طاقت کا جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے امریکہ پُر کرے۔ امریکہ کے حکمرانوں کی نظر میں اصل خطرہ سوویت یونین اور چین کی طرف سے تھا، تاہم ایوب خاں کی رائے میں بھی وزن تھا اور امریکیوں کے لیے اُن کی دلیلوں کو مسترد کرنا آسان نہ تھا۔ اُن کی صاف گوئی، کھرے پن اور فیصلہ کن اندازِ گفتگو کا اِس لئے زیادہ اثر ہوا اِس کے برعکس ہندوستان کی بین بین رہنے کی پالیسی سے امریکن تنگ آنے لگے تھے۔ وہ یہ البتہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے ذہن پر ہندوستان کا خطرہ بُری طرح مسلّط ہے، تاہم اُنھیں یہ اُمید تھی کہ وہ رفتہ رفتہ پاکستان کو اس کا قائل کر لیں گے کہ اُسے ہندوستان کے ساتھ اپنا داخلی جھگڑا ختم کر دینا چاہیے اور اُس بیرونی خطرے کی طرف توجہ کرنا چاہیئے جو امریکہ کی نظر میں کہیں زیادہ سنگین تھا۔

الغرض ۱۹۵۶ء میں جب امریکہ کے فوجی امداد کے منصوبے پر عملدرآمد شروع ہوا، تو امریکہ جذباتی طور پر برّصغیر کے معاملات اور پاکستان کے دفاعی امور سے پوری طرح وابستہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کے دس سال میں پاکستان کی افواج کو ایسے اسلحہ سے لیس کیا گیا جو امریکہ کے خیال میں پاکستان کی مخصوص جغرافیائی اور سیاسی صورت کے پیشِ نظر اُس کے تحفظ کے لئے ضروری تھے۔ اُس دہائی کے پہلے نصف میں امریکہ کے حلیفوں کی صفِ اوّل میں پاکستان پیش پیش رہا اور اس کا محسن یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا رہا کہ جہاں ذرا سا بھی موقع ملتا پاکستان امریکہ کی طرفداری کے لئے کود پڑتا۔ امریکہ اور پاکستان کے نئے تعلقات کی جو صورت بن رہی تھی اُس میں ایک گہری باہمی وابستگی مضمر تھی، اور یہ اسی وابستگی کا فطری تقاضا تھا کہ پاکستان "سیٹو" (SEATO) اور پھر معاہدۂ بغداد

بعد میں سینٹو (CENTO) میں شامل ہو جائے۔

پاکستان جیسے جیسے امریکہ سے قریب ہوتا گیا اُسی مناسبت سے ہندوستان امریکہ سے کھنچتا چلا گیا۔ اُس نے امریکہ کے ساتھ پاکستان کے خصوصی تعلقات کو شروع سے شبہے کی نظر سے دیکھا تھا۔ اُسے اس ضمن میں پاکستان کی نیت پر شک تھا، اور دوسری طرف اِس ضرورت کا احساس بھی کہ برِصغیر میں طاقت کا توازن خود اُس کے حق میں رہے۔ اِس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی پالیسی پر ہندوستان کی تنقید سخت سے سخت تر ہونے لگی۔ اور جیسے جیسے ہندوستان پر اپنے پھیلتے ہوئے فوجی نظام کا مالی بوجھ بڑھتا رہا اُسی مناسبت سے امریکہ کے خلاف اُس کا غم و غصّہ بھی تیز تر ہوتا گیا۔

اِس عرصے میں سوویت یونین کی قوّت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا رہا، اور ۱۹۶۰ء تک صورت یہ ہوگئی کہ وہ امریکہ کا مدِّمقابل بن کر میدان میں آگیا۔ اس کی صنعت کی بنیادیں اتنی وسیع ہوگئی تھیں اور فوجی قوّت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُس میں مؤثر طور پر امریکہ کی مزاحمت کا دم خم پیدا ہوگیا تھا۔ اُس کا جوہری ہتھیاروں کا ذخیرہ مقدار اور معیار میں تیزی سے بڑھ رہا تھا اور امریکی عوام پر یہ واضح ہو رہا تھا کہ اگر ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو اُن کے معاشرتی اور اقتصادی نظام پر اُس کے اثرات کتنے تباہ کن ثابت ہوں گے۔ اُس سے پہلے دس سال تک امریکہ کو ایٹمی اسلحہ میں مکمل بالادستی حاصل رہی تھی۔ اور اُس کی فوجی قوّت میں اِس فوقیت کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ اب صورتِ حال بدل چکی تھی اور امریکہ کے جوہری ہتھیاروں کی سیاسی اہمیت گھٹ رہی تھی۔ اِسی کے ساتھ یہ احساس بھی بڑھتا رہا، کہ اگرچہ ایٹمی ہتھیار رکھنا اِس لیے ضروری ہے کہ فریق مخالف کو ایٹمی حملے سے باز رکھا جائے، تاہم

یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اِن اسلحہ کو قومی پالیسی میں آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ صورتحال میں اس دوررس تبدیلی کا اثر لازماً بین الاقوامی فوجی معاہدوں پر پڑا۔ "سیٹو" اور "سینٹو" جو کبھی کوئی زیادہ واضح شکل اختیار نہ کرسکے تھے، اپنا وہ محدود اثر بھی کھونے لگے جو امریکہ کی وابستگی سے انھیں حاصل ہوا تھا۔ صدر آئزن ہاور کے دوسرے عہدِ حکومت کے آخری چند مہینوں میں ان معاملات میں امریکی نقطۂ نظر اور محکمۂ خارجہ کے رویے میں ایک واضح اور نمایاں تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ بلکہ ۱۹۵۹ء میں ڈلّس کی رحلت سے پہلے بھی امریکی پالیسی میں تبدیلی کی یہ علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ بین الاقوامی امور میں غیر جانبداری کی پالیسی اب امریکہ کی نظر میں قابل تنفّر نہ رہی تھی اور بڑے پیمانے پر فوجی امداد کے منصوبوں کی افادیت پر لوگوں کو شک ہونے لگا تھا۔

امریکی نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی ہندوستان میں مقبول ہوئی، اگرچہ پاکستان کو امریکہ سے جو فوجی امداد مل رہی تھی اُس سے ہندوستان کو خلش ہوتی رہی۔ امریکی پالیسی کی جو پذیرائی اُس وقت ہندوستان میں ہوئی چند سال پہلے اُس کا تصوّر بھی ممکن نہ تھا۔ پھر ۱۹۶۰ء کے اواخر میں جان کینیڈی امریکہ کے صدر منتخب ہوئے اور اس تبدیلی سے ہندوستان اور امریکہ ایک دوسرے سے اِتنے قریب ہوگئے جتنے اُس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ اگرچہ امریکہ کے محکمۂ دفاع میں اب بھی پاکستان کے بہت سے حمایتی موجود تھے۔ تاہم محکمۂ خارجہ کا روّیہ وہ نہ رہا جو پہلے تھا۔ قوم اور حکومت کے بدلے ہوئے مزاج کا اثر لازماً محکمۂ خارجہ کے روّیے پر بھی پڑا اور روز بروز بڑھتا رہا۔ پاکستان کی نظر میں کینیڈی کے تین سالہ عہدِ حکومت میں امریکہ کی خارجہ پالیسی پر آزاد خیالی اور حرّیت پسندی کا جو رنگ چڑھا وہ زیادہ تر

مصنوعی تھا۔

اُسی عرصے میں ہندوستان اور چین کی آویزش سے پاکستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات میں اور کشیدگی پیدا ہوئی۔ امریکہ کی طرف پاکستان کا دوستانہ رویّہ تیزی سے بدلنے لگا اور اُس کی جگہ مایوسی اور بدگمانی نے لے لی۔ امریکہ نے بڑے پیمانے پر ہندوستان کو فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا تو یہ پاکستان کو بہت ناگوار گزرا۔ پاکستان کی رائے میں امریکہ کو چاہیئے تھا کہ وہ اِس موقع کو پاکستان کے حق میں استعمال کرے اور ہندوستان کو چین کے خلاف امداد اِس شرط پر دے کہ وہ پہلے مسئلہ کشمیر کا کوئی معقول حل قبول کرلے۔ اِس کے علاوہ، اگر امریکہ کی نظر میں ہندوستان کے لیے فوجی امداد انتہائی ضروری تھی تب بھی اِس فیصلے پر عمل پاکستان کی منظوری کے بغیر نہ ہونا چاہیئے تھا، اور امداد بھی اُسی مقدار میں فراہم کی جاتی جو امریکہ اور پاکستان دونوں کے اندازے کے مطابق ضروری قرار پاتی۔

ہندوستان کو چین کے خلاف جو امداد امریکہ سے ملی وہ مقدار میں بہت زیادہ نہ تھی، لیکن پاکستان میں لوگوں کو اُس سے بہت تشویش ہوئی اور امریکہ کے خلاف جو عام خفگی تھی اُس میں شدّت پیدا ہوئی۔ اُدھر امدادی کارروائیوں کے سلسلے میں امریکہ کو ہندوستان کی افواج سے براہِ راست واسطہ پڑا تو امریکی محکمۂ دفاع کو معلوم ہوا کہ اُن کے اسلحہ اور فنّی نظام میں بہت سے پرانے نقائص ہیں۔ بہرحال امریکہ کو چین سے ایک فطری تنفّر تھا اور وہاں عام رائے یہی تھی کہ ہندوستان کے حوصلے اور اُس کی فوجی قوّت بحال کرنا نہایت ضروری ہے۔ اِس وجہ سے امریکی حکومت کا عزم اور بھی مضبوط ہوگیا کہ وہ ہندوستان کی مدد کرے لیکن ظاہر ہے کہ یہ امداد اُسی حد تک دی جاسکتی تھی جہاں تک خود امریکہ

کے قومی مقاصد کا تقاضا ہو۔ ہندوستان کی فوجی امداد سے پاکستان کا خدشہ بیجا نہ تھا اور امریکہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اِس ضمن میں پاکستان کے اعتراضات کو نظرانداز کر دے۔ اِس سوال پر تو امریکہ اور پاکستان میں بڑا اختلاف تھا کہ اِن خدشات میں کتنی حقیقت ہے اور اُن کا ہندوستان کے لیے امریکی امداد پر کتنا اثر پڑنا چاہیے، لیکن یہ سچ ہے کہ امریکہ نے پاکستان کے مفاد کو ملحوظ رکھنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ چنانچہ اُس نے ہندوستان کو فوجی امداد محدود کر دی۔ اِس کے باوجود جتنی امداد ہندوستان کو ملی اُس کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ برّصغیر میں طاقت کا توازن اور بگڑ گیا اور ہندوستان کی فوقیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ، ہندوستان اور چین کی لڑائی کے تین سال بعد واقع ہوئی۔ یہ تین سال پاکستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات کا سب سے کٹھن دور ثابت ہوئے۔ ایک طرف ہندوستان کی فوجی قوّت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور پاکستان کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر، یہ طاقت اُسی کے خلاف استعمال ہوگی۔ دوسری طرف امریکہ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مناقشات میں اُلجھنے کو بالکل تیار نہ تھا، اور کمیونسٹ چین کے مدِّمقابل کی حیثیت سے ہندوستان کو مضبوط کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال سے امریکہ اور پاکستان کی دوستی کی بنیاد لازماً متاثر ہوئی اور اُن کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ کشیدگی اُن کی دوستی کو شاید بالکل ہی ختم کر دیتی، لیکن ایوّب خاں نے حالات کو اس نوبت تک پہنچنے سے بچا لیا، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ امریکی حکمران معقول اور قابلِ اعتبار لوگ ہیں۔ بہرحال، پاکستان میں امریکہ کے خلاف ناراضی کا اظہار زیادہ کھُل کر ہونے لگا اور اِسی مناسبت سے پاکستان کی پالیسی پر امریکہ کی برہمی بڑھنے لگی۔

اس بین الاقوامی پس منظر میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ء کی لڑائی شروع ہوئی، اور جنگ کے سلسلے میں امریکی رویّے اور عمل کا جائزہ لیتے وقت اِس پس منظر کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ میں یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ امریکہ کو جنگ شروع ہونے سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ ہندوستان نے مغرب میں پاکستان کی بین الاقوامی سرحد پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس حملے کا ایک اثر یہ ہو سکتا تھا کہ چین ہندوستان کی شمالی سرحد پر کارروائی شروع کر دے۔ ہندوستان کو حال ہی میں چین کے ہاتھوں جو شکست اُٹھانی پڑی تھی۔ اس کے اثر سے وہ اب تک ڈرا ہوا تھا اور اُس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ امریکہ کی اطلاع کے بغیر کوئی ایسا جنگی اقدام کر بیٹھے گا جس میں چین سے تصادم کا خطرہ مضمر ہو۔ لہٰذا یہ قیاس بے جا نہ ہو گا کہ ہندوستان نے امریکہ کو یہ سمجھایا ہو گا کہ اگر پاکستان کے خلاف کارروائی تیز رفتاری سے کی جائے اور اُس کے ذریعے لاہور کو فتح کر لیا جائے تو پاکستان کو سبق مل جائے گا، امریکہ اور ہندوستان کی طرف اس کا رویّہ بہتر ہو جائے گا اور عموماً بین الاقوامی معاملات میں اُس کا طرزِ عمل ہندوستان اور امریکہ کے نقطۂ نظر سے سازگار ہو جائے گا۔ اِس طرح یہ عین ممکن ہے کہ پاکستان کا چین پر تکیہ کرنے کا رجحان ختم ہو جائے اور وہ اپنے اقتصادی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے مغرب پر زیادہ بھروسا کرے۔

الغرض جب ۶ ستمبر کی صبح کو ہندوستان نے واگہ پر حملہ کیا تو امریکہ کا سایہ مغربی پاکستان کے میدان پر دور تک پڑ رہا تھا

دسواں باب

۱۰ ستمبر کے قریب بری جنگ میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ آزاد کشمیر، فیروز پور کے علاقے اور سندھ و جودھ پور کی سرحد پر کچھ کارروائیوں سے قطع نظر، ہندوستان کے حملے کا اصل زور سیالکوٹ اور نارووال کے علاقہ (Sector) میں تھا۔ ہندوستانیوں کو یہ امید تھی کہ وہ وہاں بڑا جارحانہ حملہ کر کے لاہور اور راولپنڈی کے درمیان ہمارے مواصلات کے مرکزی سلسلے کاٹ دیں گے، لاہور کے دفاعی مورچوں کے آگے اپنی فوج پھیلا دیں گے اور پٹھان کوٹ اور جموں کے درمیان اپنے غیر محفوظ ذرائع رسد کو بچا سکیں گے۔ لاہور کے مقابل، شہر کے نواحی علاقوں سے سات آٹھ میل دور، ہندوستانیوں کی پیش قدمی روک دی گئی تھی، لیکن جو رقبہ ہمارے قبضے سے نکل چکا تھا اُس کا بیشتر حصّہ ہم واپس نہ لے سکے تھے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں میں بھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ مزید آگے بڑھ سکتے۔ نارووال اور سیالکوٹ کے علاقہ میں لڑائی نے یہ شکل اختیار کر لی تھی کہ دشمن نارووال اور وزیر آباد

کے درمیان ریلوے لائن پر قابو حاصل کرنے کی سخت کوشش کر رہا تھا۔ ہماری طرف فوج کی اعلیٰ کمان میں قوّتِ فکر کا فقدان تھا اور یہ بہت کچھ اسی کوتاہی کا نتیجہ تھا کہ ہمیں دفاعی انداز اختیار کرنا پڑا اور ہندوستان کی سبقت بڑی حد تک قائم رہی۔ سیالکوٹ اور نارووال کے علاقے میں دشمن کے پاس ایک بکتر بند اور تین پیادہ ڈِویژن تھے۔ اِس کے مقابلے میں ہمارے پاس ایک بکتر بند اور صرف ایک پیادہ ڈویژن تھا۔ دوسرے محاذوں پر بھی ہندوستان کو تعداد میں ہم پر فوقیت حاصل تھی۔ اِس صورت میں ہمارے لیے یہ لازم تھا کہ ہم خود حملہ کریں۔ جنگ خواہ برّی ہو، فضائی یا بحری، جس فریق کی فوجیں تعداد میں کم ہوں وہ دشمن پر سبقت اسی طرح حاصل کر سکتا ہے کہ خود جرأت مندی سے حملے کرے۔

یہ ناممکن تھا کہ میدان میں جنگ کی رفتار پر فوج کے کمانڈر کی شخصیت کا گہرا اثر نہ پڑے، چنانچہ ہماری فوج کے ردِّ عمل میں اعلیٰ کمان کے اندازِ فکر کا اثر نمایاں تھا۔ چونکہ ہماری فوجیں تعداد میں نِسبتاً کم تھیں اور ہمارے وسائل محدود تھے اس لیے بہ ظاہر آسان راستہ تو یہی تھا کہ "احتیاط" برتی جائے اور جارحانہ کارروائی کے بجائے دفاعی عمل پر اکتفا کیا جائے۔ لیکن حقیقت میں کسی چھوٹی فوج کے لیے، جو دشمن کے مقابلے میں کمزور ہو، یہ راستہ احتیاط کا نہیں تباہی کا ہے۔ اگر ہم یہ راستہ اختیار کرنے کے باوجود تباہی سے بچ گئے تو اس وجہ سے کہ ہمارے سپاہی لڑنے میں بہت اچھے تھے اور ہمارے نوجوان افسروں نے انتہائی مشکل حالات میں بڑی دلیری اور مردانگی سے قیادت کے فرائض انجام دیے۔ فیروز پور، سندھ اور جودھ پور کی سرحد، پر لڑائی کا اثر براہِ راست مرکزی میدانِ جنگ پر نہ تھا، لہٰذا وہاں کی فوجوں کو ہیڈکوارٹرز سے وہ ہدایت حاصل نہ ہوئی جو لاہور اور سیالکوٹ کے

کمانڈروں کو ملتی رہی۔ اُن کی یہ محرومی اُن کے حق میں رحمت ثابت ہوئی، کیونکہ تعداد میں دشمن سے کم ہونے کے باوجود انھیں نقل وحرکت اور تدبیر وعمل میں زیادہ آزادی حاصل رہی اور اعلیٰ کمان کی ہدایتوں اور احکام نے اُن کی کارروائیوں میں نسبتاً کم رکاوٹ ڈالی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ زیادہ جرأت سے کام لے کر جارحانہ طرزِ عمل اختیار کر سکے۔ فیروز پور کے علاقے میں ہندوستان کے ایک پورے پیدل ڈویژن کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف ایک بریگیڈ فوج تھی۔ اور سندھ اور جودھ پور کی سرحد پر ہمارے محض دو بٹالین ہندوستان کے دو بریگیڈوں کے مقابل تھے۔ ان دونوں جگہوں پر ہم نے دشمن کو دفاعی لڑائی لڑنے پر مجبور کر دیا۔

اعلیٰ کمان نے ہماری فوجوں کو جس وضعِ احتیاط اور بودے پن پر مجبور کیا وہ ہمارے جوانوں کے فطری میلانات، اور میدانِ جنگ میں ہمارے کمانڈروں کی رائے کے برعکس تھا۔ اکثر موقعوں پر ایسا ہوا کہ کمانڈر کے اندازے کے مطابق وقت حملہ کرنے کا تھا، لیکن ہیڈکوارٹرز نے اس کی ممانعت کر دی۔ عموماً جنگ میں کسی فوج کے کمانڈر پر یہ لازم نہیں ہوتا کہ اپنے محاذ پر حملہ شروع کرنے سے پہلے وہ اپنے سے بالاتر حکام سے اجازت حاصل کرے لیکن اس جنگ میں اعلیٰ کمان کی طرف سے اکثر یہ اجازت لازمی قرار دی گئی۔ لاہور اور سیالکوٹ کے کمانڈروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ کوئی حملہ کرنے سے پہلے جنرل ہیڈکوارٹرز کی منظوری حاصل کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی یا بٹالین کا سربراہ حملے کی تحریک کرتا، پھر اس کی تجویز بریگیڈ اور ڈویژن سے ہوتی ہوئی کور کے مرکز تک پہنچتی۔ اس عمل میں بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا اور تجویز جی۔ ایچ۔ کیو تک اس صورت میں پہنچتی جب بیچ کے سارے کمانڈر اُس سے متفق

ہوتے۔جی۔ایچ۔کیو کا جواب عموماً یہی ہوتا کہ حکم کا اِنتظار کرو، یا یہ کہ حملہ نہ کرو۔

حملے کا فیصلہ کمانڈر صورتِ حال کے اپنے اندازے کے مطابق کرتا ہے۔صورتِ حال کے بعض پہلو تو ایسے ہوتے ہیں جن کا اندازہ کسی مادّی معیار سے کیا جاسکتا ہے۔اور جن کے متعلق کوئی ایسا ماہر بھی رائے قائم کرسکتا ہے جو موقع پر موجود نہ ہو۔لیکن بعض دوسرے پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا صحیح اندازہ خود اُس کمانڈر ہی کو ہوسکتا ہے جس کا اُن سے براہ راست واسطہ ہوا اور جو موقع سے دور بیٹھے ہوئے جی۔ایچ۔کیو کے جرنیلوں کو آسانی سے سمجھائے نہیں جاسکتے۔مثلاً موقع کی زمین، دشمن کا طرزِ عمل، اُس کے مورچوں کی ترتیب، اُس کے سپاہیوں کے حوصلے اور مزاج کی کیفیت۔میدانِ جنگ کے اِن پہلوؤں کے متعلق صحیح معلومات اعلیٰ کمان کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچانا محال نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔اور ان سب باتوں سے قطع نظر، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی فوج کو لڑنا ہے، تو اس پر یہ پابندی بے معنی ہے کہ لڑنے سے پہلے وہ اس کے لیے اجازت کا انتظار کرے۔بدقسمتی سے اِس جنگ میں ہماری اعلیٰ کمان کا رویّہ اس کے برعکس تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری فوجوں کی جارحانہ صلاحیتیں مفلوج ہوکر رہ گئیں۔جو کمانڈر فطرتاً بودے تھے وہ اور زیادہ بودے ہوگئے، اور جو دلیر تھے انھیں اُس احتیاط نے مار دیا جو اُوپر سے اُن پر مسلّط کی گئی تھی۔مجھے تو تعجب اِس بات پر ہے کہ اِن حالات میں ہماری فوجوں نے جو کارگزاری دکھائی وہ کیونکر ممکن ہوئی۔

ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ ہماری فوجیں اپنے بکتر بند دستوں کو ٹینک شکن کارروائیوں کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہوگئیں۔یہ صحیح ہے کہ ہمارے پاس پیادہ فوجوں کی کمی تھی، لیکن اس فیصلے کی اصل وجہ یہ تھی کہ فوج کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی

اُن میں نہ قوّتِ تخیل تھی نہ جرأت۔ سیالکوٹ اور چونڈا کے علاقے میں لڑائی نے ٹینکوں کے دستوں کے درمیان ایک اندھا دھند مقابلے کی شکل اختیار کر لی۔ دونوں طرف ٹینکوں کا بھاری نقصان ہوا اور جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ دونوں حریف زچ ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ تعطّل اُسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ کسی ایک فریق کے جرنیل غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کریں۔ لیکن یہ صلاحیت دونوں طرف مفقود معلوم ہوتی تھی۔ ہندوستانی فوج تعداد میں زیادہ تھی لیکن وہ بھی کوئی خاص پیش قدمی نہ کر سکی۔ اس نے ہمارے دفاعی مورچوں سے گذر کر آگے بڑھنے کے لیے چند چھوٹے چھوٹے قدم بڑی احتیاط سے اُٹھائے، اور بس۔ اصل میں دشمن کی کارروائیوں کا ہدف ہمارے ابتدائی دفاعی مورچے تھے، لیکن اُس میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کافی عزم نہ تھا، نہ وہ اس کے لیے موثر جنگی تدبیریں اختیار کر سکا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ نقل و حرکت کی جنگ فی الحال ختم ہو گئی ہے اور دونوں حریف اپنے اپنے مورچوں کو مستحکم کرنے میں لگ گئے ہیں۔

کھیم کرن میں ہمارے بکتر بند دستوں کی پیش قدمی گویا ایوّب خاں کی فوجی زندگی کا نقطۂ عروج تھی۔ اُس اقدام سے اُن کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ اُس کا منصوبہ بنانے والوں نے صورتِ حال کا اندازہ کرنے میں ایسی حقیقت ناشناسی کا ثبوت دیا، حملے کے لیے ایسا غلط وقت مقرّر کیا، اور تیاری اتنی ناقص تھی کہ کامیابی کا امکان بہت کم رہ گیا۔ اس حملے کی ناکامی کے بعد ایوّب خاں کے حوصلے پست ہونے لگے، اور پھر جب سیالکوٹ اور نارووال کے علاقے میں دونوں فوجیں زچ ہو کر بیٹھ گئیں تو ایوّب خاں کا اعتمادِ نفس بھی ختم ہونے لگا۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ اپنے تئیں اس بات پر ملامت

کرنے لگے ہیں کہ انھوں نے ملک کو ایسی مشکل میں پھنسا دیا، اور انھیں اس میں شک ہے کہ پاکستان بالآخر لڑائی میں کامیابی حاصل کر لے گا۔ ایسی صورت میں جو اُس وقت ملک کو درپیش تھی ساری قوم فطرتاً اپنے رہنما کے ہر قول و فعل اور ہر قدم پر بڑی گہری نظر رکھتی ہے، اور سربراہ کے رویّے اور اندازِ فکر کا اثر ایک متعدی مرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایمان کی صلاحیت اور دشمن کے خلاف سرکشی کے جذبے سے کسی قوم کا عزمِ مجادلہ قائم اور قوی رہتا ہے، اس کے برعکس شکست خوردگی سے اُس کا عزمِ مدافعت کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ جنگ کے اُن دنوں میں، جب ایوّب خاں کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ اُن کو سہارا دینے کی بڑی ضرورت تھی۔ چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو، جو وزیرِ خارجہ تھے، وزارتِ دفاع کے سکریٹری نذیر احمد، اور میں ہر شام لازماً ایوّب خاں سے ملنے جایا کرتے۔ اس وقت وہ عموماً بلیک آؤٹ کے اندھیرے میں اپنے مکان کے لان پر بیٹھا کرتے۔ ہم تینوں کی کوشش یہ ہوتی کہ انھیں جنگ کی صورتحال کا روشن پہلو دکھا کر اور ہندوستان کی مشکلات بیان کر کے، ان کی ہمّت بڑھائیں۔ نذیر احمد اکثر انھیں یاد دلاتے کہ اسی طرح کے حالات میں نپولین اور چرچل کیا کہا اور کیا کرتے تھے۔ اِن کوششوں نے چند روز تک ایوّب خاں کا حوصلہ برقرار رکھنے میں یقیناً مدد کی، لیکن جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ یہ اثر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گا۔ بھٹو تو چند دن بعد اقوامِ متحدہ کے اجلاس کے لیے روانہ ہو گئے، لیکن نذیر احمد نے اور میں نے صدر سے اپنی ملاقاتیں جاری رکھیں اور انتہائی کوشش کی کہ ان کا حوصلہ قائم رہے اور لڑائی جاری رکھنے کا عزم کمزور نہ پڑے۔ میں نے چونکہ بیرونِ ملک سے سامانِ جنگ، ہتھیاروں اور گولہ بارود کی

نقل ورسد کی ذمے داری خود اپنے سر لے لی تھی، لہٰذا میں ایوبؔ خاں کو اس کی بابت یہ یقین دلاتا رہا کہ صورتِ حال اطمینان بخش ہے، رسد کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا اور فوج کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی۔

۱۸ ستمبر کو صدر ایوب نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور یہ نہایت ناقص ثابت ہوا۔ اُن کے اندازِ اظہار میں "تذبذب نمایاں تھا اور سُننے والوں نے، جن میں بہت سے غیر ملکی صحافی شامل تھے، اس سے یہ اثر لیا کہ ایوبؔ خاں کا عزم کمزور پڑ رہا ہے، ایک اور اہم علامت یہ ظاہر ہوئی کہ ایوبؔ خاں نے برطانوی ہائی کمشنر مورس جیمز، سے تنہائی میں ملاقاتیں شروع کر دیں۔ مورس جیمز ان دنوں ہندوستان اور پاکستان دونوں سے بار بار یہ اپیل کر رہے تھے کہ وہ جنگ بندی پر تیار ہو جائیں۔ ایوبؔ خاں کی تنہائی میں اُن سے ملاقاتیں کچھ غیر معمولی معلوم ہوتی تھیں اور اُن سے یہ شک پیدا ہوتا تھا کہ ایوبؔ خاں اُن سے کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتے ہیں جو وہ خود اپنے مشیروں سے چھُپانا چاہتے ہیں۔ اِس اشارے کے علاوہ بھی ان کے عمومی رویّے اور کیفیتِ مزاج سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی سمجھوتے کی تلاش میں ہیں۔ مورس جیمز ایک تجربے کار سفیر تھے اور انھوں نے جلد ہی صدر ایوبؔ کے مزاج کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ انھوں نے تنہائی کی ان ملاقاتوں سے فائدہ اُٹھایا اور ایوبؔ خاں کو متنبہ کیا کہ اگر جنگ فوراً بند نہ کی گئی تو پاکستان کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اِمتحان کی اس گھڑی میں پاکستان کی افواج کے سربراہ ملک کے کسی کام نہ آسکے۔ برّی فوج کے سپہ سالار جنرل موسیٰ، برسوں ایوبؔ خاں کے وفادار نائب رہے تھے۔ ان کے طرزِ عمل کا بنیادی اُصول یہ تھا کہ پہلے وہ "صاحب" کی کیفیتِ مزاج

اور خیالات کا اندازہ لگا لیتے اور پھر انھیں پوری طرح سمجھے بغیر اُن سے اپنے اتفاق کا اظہار کر دیتے۔ اس موقع پر انھوں نے محسوس کیا کہ حالات مشکل ہیں، اور ان کے متعلق ایوّب خاں کے خیالات سے تو وہ واقف تھے ہی۔ چنانچہ انھوں نے صورتِ حال کا وہی نقشہ پیش کیا جو ایوّب خاں اپنے ذہن میں پہلے ہی بنا بیٹھے تھے۔ اس نقشے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک چھوٹی فوج مقابلتاً ایک بہت زیادہ قوی دشمن سے اس حال میں لڑ رہی ہے کہ اُس کے پاس گولے بارود کی سخت قلّت ہے اور وسائل ناکافی ہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ صدر کے غیر فوجی مشیروں پر بھی تہمت لگایا کرتے تھے کہ اُن ہی نے ایوّب خاں کو اس مصیبت میں پھنسا دیا ہے، اور خود یہ مشورہ دیتے تھے کہ اِس جنونی جنگ سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

اس کے برعکس نور خاں، برّی فوج میں اپنے ہم منصب کی طرح دل کے بودے تو نہ تھے، تاہم اُن کے نقطۂ نظر سے بعض اور باتیں بہت اہم تھیں جنھوں نے اُن کی رائے کو متاثر کیا۔ ایک یہ کہ فضائیہ کی کارگزاری اُس وقت تک نہایت اچھّی رہی تھی اور اُس کی شہرت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اگر جنگ کچھ عرصہ اور جاری رہی تو لازماً یہ نوبت آجاتی کہ اُس کے نقصانات کی تلافی نہ ہو۔ اور وہ ضرب وحرب کے لائق نہ رہے گی۔ اُس کے مقابلے میں ہندوستان کے پاس طیّاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور نور خاں کا اندازہ تھا کہ محض تعداد کی اس فوقیت کی بنا پر دشمن کی فضائیہ زیادہ طویل عرصے تک لڑائی کے قابل رہے گی۔ ایسی صورت میں پاکستانی فضائیہ کے شاندار کارنامے مٹی میں مل جاتے اور ظاہر ہے کہ یہ تصوّر نور خاں کے

لیے خوش آئند نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ماموں نواب امیر محمّد خاں کالا باغ کا وقیع مشورہ بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ نواب صاحب اس وقت مغربی پاکستان کے گورنر تھے اور صدر ایوّب اور نور خاں دونوں اُن کا اثر بہت جلد قبول کرتے تھے۔ وہ اُنیسویں صدی کے جاگیرداروں کا مکمل نمونہ تھے۔ اُن کا اندازِ فکر سراسر جاگیردارانہ تھا۔ اور مزاج قدامت پرست۔ ایوّب خاں پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ وہ نواب کالا باغ کو ایک حقیقت پسند اور عملی آدمی سمجھتے تھے اور اُن کی رائے اور مشورے پر ایوّب خاں کو کامل عقیدہ تھا۔ امیر محمّد خاں گورنر کی حیثیت سے لاہور میں مقیم تھے اور یوں میدانِ جنگ سے قریب تر تھے لیکن اُن کے خیالات اور عوام کے مزاج کی کیفیت میں اتنا ہی بُعد تھا جتنا ایوب خاں اور عوام کے احساسات میں۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ اگر لڑائی جاری رہی تو وہ معاشرتی نظام ٹوٹ کر بکھر جائے گا جس کے وہ خود ایک ستون تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اُن حالات میں پاکستان نے جو راستہ اختیار کیا۔ اُس کے تعیّن میں نواب کالا باغ کے مشوروں کو بڑا دخل تھا۔

اِدھر ایوّب خاں اور اُن کے قریبی مشیر تو کسی سمجھوتے کی تلاش میں تھے ہی، اُدھر افغانستان نے اپنی فوجوں کو مجتمع کرنے اور حرکت میں لانے کا اِعلان کر دیا اور فوجی عملے کی رخصتیں منسوخ کر دیں۔ یہ اقدام بہ ظاہر اس وجہ سے کیا گیا کہ وہاں عام انتخابات ہونے والے تھے اور ان میں کسی بد امنی کی صورت میں فوج کے استعمال کی ضرورت پڑ سکتی تھی لیکن اصل مقصد غالباً کچھ اور تھا وہ یہ کہ ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر چینی فوج کی نقل و حرکت کی وجہ سے جو دباؤ ہندوستان پر پڑ رہا تھا اس کی کچھ تلافی ہو سکے۔ افغانستان کے تعلقات ہندوستان سے ہمیشہ دوستانہ رہے تھے اور ہماری سرزمین کے کچھ حصوں پر بزعم خود کابل

کے دعوے کا علم ساری دنیا کو تھا۔ لہٰذا افغانستان کے اس اقدام پر کسی کو تعجب نہ ہوا تاہم یہ کارروائی ایسے وقت پر عمل میں آئی جب پاکستان کے لیے حالات ایک نہایت نازک موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ اُس وقت ایوبؔ خاں کسی ایسے ہی بہانے کی تلاش میں تھے، کہ اس کی آڑ میں وہ لڑائی ختم کرانے کے لیے مذاکرات کی رفتار کو تیز تر کر دیں۔ لہٰذا افغانستان کے اقدام نے صورتِ حال پر زبردست اثر ڈالا۔

میں نے اکثر اس پر غور کیا ہے کہ اگر لڑائی کچھ عرصے اور جاری رہتی تو افغانستان کا طرزِ عمل کیا ہوتا۔ میرا خیال اس وقت بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے کہ افغانستان کی طرف سے بھرپور مداخلت کا امکان زیادہ نہ تھا۔ ہاں اگر پاکستان کی قوّتِ مقابلہ بالکل جواب دے جاتی اور پنجاب میں دشمن زبردست کامیابیاں حاصل کر لیتا، تو افغانی مداخلت کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شمال مغربی سرحدوں پر ہماری فوجی قوّت زیادہ نہ تھی لیکن اُس سنگلاخ سرزمین پر ہماری فوج زیادہ بھاری ہتھیاروں اور ساز و سامان کے بغیر بھی اچھی طرح مدافعت کر سکتی تھی۔ اور ہماری فضائیہ افغانستان کے خلاف اُس سے بھی زیادہ مؤثر کارروائی کر سکتی تھی، جو اُس نے ہندوستان کے خلاف کی تھی۔ فوجی نوعیت کی ان رکاوٹوں سے زیادہ اہم ایک سیاسی رکاوٹ تھی جو غالباً کابل کو ہماری جنگ میں مداخلت سے باز رکھتی، یعنی افغان قوم کے سیاسی فکر کا عام رجحان اور پاکستان کے ساتھ اُس کے نسلی اور دینی رابطے۔ اُس وقت پاکستان اپنی بقا کے لیے لڑ رہا تھا اور کابل میں کوئی حکومت بھی ہوتی، ایسے موقع پر اُس کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا کہ وہ اپنے عوام میں پاکستان کے خلاف جنگ کے لیے جوش و خروش پیدا کرے۔ افغان حکمران یہ کیسے بھول سکتے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر کی جنگ میں، جسے بہت

سے لوگ ناانصافی اور ظلم کے خلاف جہاد تصوّر کرتے تھے، افغان رضا کار بڑی تعداد میں پاکستانیوں کے شانہ بہ شانہ لڑے تھے۔ اس کے علاوہ افغانستان چین کی قوت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ تین ہی سال قبل چین نے ہندوستان کو ایسی زبردست فوجی شکست دی تھی جس نے ہندوستان کے پورے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کی حکومت کے استحکام کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چین کھلم کھلا شریک تو نہیں ہوا، اور نہ اُس نے اپنے ارادے آخر تک ظاہر کیے، تاہم ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر چین کا خطرہ برابر منڈلاتا رہا۔ ایک اور رکاوٹ یہ تھی کہ دنیا کے قریب قریب تمام مسلم ممالک سفارتی سطح پر پاکستان کی مکمل اور موثر حمایت کر رہے تھے۔ دنیائے اسلام کے اس رویّے کا اثر اگر افغانی حکومت پر نہیں تو وہاں کے عوام پر ضرور پڑتا۔ افغان قوم بین الاقوامی سیاست میں تجربہ کار اور مشّاق ہے۔ اور اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اس حقیقت کا ادراک ضرور ہوگا کہ ہندو مت نے اب جنگ کے ذریعے اپنا اقتدار اور اثر پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ اگر اُس نے پاکستان کو زیر کر لیا تو اُس کے قدم رُکیں گے نہیں اور اس کی سرحدوں کو دریائے سندھ کے کنارے تک محدود رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ جلد یا بدیر خود افغانستان کو اُس سے خطرہ لاحق ہوگا۔

بہرحال ہوا یوں کہ افغانستان کے شاہ اور وزیر اعظم نے کابل میں ہمارے سفیر، جنرل محمّد یوسف کو یقین دلایا کہ ان کی فوجوں کی نقل و حرکت کا رُخ پاکستان کی طرف نہیں ہے اور افغان قوم کسی حالت میں بھی اپنے پاکستانی بھائیوں پر پیچھے سے حملہ نہیں کرے گی لیکن ایوّب خاں کو پھر بھی افغانستان کی نیت پر شبہہ رہا۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں ۱۱ر ستمبر کی صبح کو ایوّب خاں سے میری ملاقات ہوئی۔

گیارھواں باب

جب میں ایوّب خاں سے ملنے گیا تو مجھے اس کی اُمید بہت کم تھی کہ میں انھیں اپنا ہم خیال بنا سکوں گا، پھر بھی میں اس کی کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ برّی جنگ کی صورتحال اور امن کے متعلق مذاکرات کی تیز رفتاری کا تقاضا تھا کہ بلا تاخیر کوئی مؤثر کارروائی کی جائے۔ ایوّب خاں سے گفتگو شروع کرتے ہوئے میں نے حالات کی رفتار پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ برّی فوج کی کارکردگی قابلِ اطمینان نہیں اور میری نظر میں اس کی وجہ یہ ہے کہ جرنیلوں کی قیادت ناقص ہے اور فوج کو کوئی معقول رہنمائی حاصل نہیں۔ جب ایوّب خاں نے اس کی وضاحت چاہی تو میں نے کہا کہ مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ بعض افسروں کو کور کمانڈروں اور چند ڈِویژن کمانڈروں کے ساتھ مشیروں کی حیثیت سے تعینات کر دیا گیا ہے تاکہ وہ منصبی فرائض کی انجام دہی میں ان کی رہنمائی کریں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اعلیٰ کمان کو اپنے کمانڈروں کی اہلیت اور صلاحیت پر پورا اعتماد نہیں۔ اگر واقعی یہی صورت ہے

توان کمانڈروں کو تبدیل کر دینا چاہیے اور اگر ضروری ہو تو اُن کے مشیروں ہی کو اُن کی جگہ تعینات کیا جائے۔ میں نے کہا کہ وہ خود اسے اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ جب تک فوج کی قیادت لائق اور باصلاحیت افسروں کے ہاتھ میں نہ ہو اُس سے کسی بڑے کارنامے کی توقع عبث ہے۔ ایوّب خاں کا خیال تھا مجھے ان دقتوں کا پوری طرح اندازہ نہیں جو فوج کو درپیش تھیں۔ ہماری فوجیں بڑے نامساعد حالات میں لڑ رہی تھیں لیکن پھر بھی انھوں نے نمایاں کارگزاری دکھائی تھی۔ اِس پر میں نے وضاحت کی کہ فوج نے یقیناً بڑی بہادری سے لڑائی لڑی اور اس کی اہمیت میری نظر میں کچھ کم نہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اگر فوج کو بہتر قیادت حاصل ہوتی تو یقیناً وہ زیادہ بڑے کارنامے انجام دے سکتی تھی۔ میں ایوّب خاں کو اس بات پر قائل نہ کر سکا اور پھر میں نے اُس دوسرے مسئلے کا ذکر چھیڑ دیا جو میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا، یعنی جنگ بندی کے لیے مذاکرات۔

مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ایوب خاں ہندوستان کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے کا ارادہ کر رہے ہیں، اور میرا خیال تھا کہ اِس وقت یہ اقدام ہمارے لیے مضر ہوگا۔ میں نے اُنھیں سمجھایا کہ اس وقت تین عوامل ہمارے حق میں ایسے ہیں جو غالباً پھر کبھی ہمیں حاصل نہ ہو سکیں۔ ایک یہ کہ قوم کے حوصلے بہت بُلند ہیں اور اُس کا عزمِ جہاد اِتنا راسخ ہے کہ وہ ہر تنگی اور تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہے۔ قوم کا یہ جوش و خروش اِتنا غیر معمولی تھا کہ اسے دیکھ کر ہی اس کا یقین ہو سکتا تھا، اور میں نے ایوّب خاں سے کہا کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ توقع نہ کر سکتا کہ جنگ سے عوام میں اِتنا غیر معمولی جوش اور جذبۂ ایثار پیدا ہو جائے گا۔

دوسری بات ہمارے حق میں یہ تھی کہ ہماری ایئر فورس فضا میں لڑائی جیت چکی تھی۔ اور اُس نے فضاؤں پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا تھا۔ اُدھر سمندر میں ہندوستانی بحریہ نے اپنے آپ کو محفوظ بندرگاہوں تک محدود کر لیا تھا۔ یہ کامیابیاں ہم نے اس امر کے باوجود حاصل کی تھیں کہ دشمن کے ہتھیار اور اس کا دوسرا سامانِ جنگ مقدار اور معیار دونوں میں ہمارے ساز و سامان سے برتر تھے۔ اِن کامیابیوں کا راز دس سال کی تربیت اور تیاریوں میں مضمر تھا، اور مجھے یقین نہ تھا کہ اگر ایک دفعہ صلح ہو کر پھر جنگ چھڑی تو ہم دوبارہ اس قسم کی کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

تیسری اہم بات یہ تھی کہ چین نے اپنی فوجیں ہندوستان کی سرحد کے قریب لا کھڑی کی تھیں۔ مجھے چین کے اس اقدام کے پس منظر کا علم تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ہماری جد و جہد کی رفتار پر اُس کا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے صدر ایوب پر یہ بھی واضح کیا کہ اگر دوسری مرتبہ جنگ چھڑی تو غالباً پھر چین ہماری حمایت میں ایسا قدم نہ اُٹھائے۔

میں نے اُن سے کہا کہ میرے خیال میں ہندوستان کی توسیع پسندی کے پیشِ نظر، جلد یا بدیر، پاکستان سے اُس کی ایک فیصلہ کن جنگ ضرور ہوگی۔ اگر وہ میری اس رائے سے متفق ہیں تو لڑائی کے لیے موجودہ حالات نہایت موزوں ہیں اور یہ توقع عبث ہے کہ آگے چل کر کبھی ہمیں اُن سے زیادہ سازگار حالات میسّر ہوں گے۔ میں نے انھیں فنِ حرب کی یہ مسلمہ حقیقت بھی یاد دِلائی کہ جس حریف میں سکت اور قوتِ برداشت زیادہ ہو وہی عموماً فتح حاصل کرتا ہے۔ جنگ میں سارا کھیل اوسان بجا رکھنے اور جرأت سے کام لینے کا ہوتا ہے اور جو حریف عزم اور تحمل سے ڈٹ جاتا ہے وہی بالآخر فیصلہ کن نتائج حاصل کر سکتا

ہے۔ جب کسی حریف کو حالات بگڑتے نظر آتے ہیں تو فطرتاً اُس کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ اپنی کمزوریوں کے اندازے میں مبالغہ کرے، کیونکہ وہ خود اپنی کوتاہیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے لیکن ایسے حالات میں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ دشمن کو بھی کچھ دقتیں اور رکاوٹیں درپیش ہیں اور ممکن ہے یہ زیادہ سنگین ہوں۔ میں نے کہا کہ ممکن ہے اِس جنگ کے بعد جب اُس کے واقعات وحالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو کہ آج کی صورتِ حال ہندوستان کے لیئے نسبتاً زیادہ ناسازگار تھی اور اگر لڑائی جاری رہتی تو دشمن کے لیے اپنے نقل وحرکت اور مواصلات کے نظام کو، جو حد سے زیادہ پھیلا ہوا تھا، سنبھالنا مشکل ہو جاتا، میں نے اِس بات پر بھی انھیں توجہ دلائی کہ ہمارے حوصلے ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ بُلند ہیں اور اگر اِس وقت جنگ بند کردی گئی تو اُس کا فائدہ ہمیں نہیں بلکہ دشمن کو پہنچے گا۔

ایوّب خاں نے میری اس گفتگو سے دلچسپی ظاہر کی، اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میری رائے اُن مشوروں سے بہت مختلف تھی جو پچھلے چند دنوں میں انھیں اپنے مشیروں سے ملے تھے۔ ایوّب خاں نے میری باتیں بڑے صبر سے سُنیں لیکن مجھ پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے بار بار کہا کہ "ہم پر بڑا دباؤ ہے" حقیقت میں دباؤ، ایک ایسی چیز ہے جس کا ٹھیک اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ دباؤ کا احساس ایک ذہنی کیفیت ہے اور اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ اُس پر دباؤ پڑ رہا ہے تو اُسے یہ سمجھانا مشکل ہے کہ درحقیقت ایسا نہیں۔ چنانچہ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ صدر سے مزید بحث کرنا بیکار ہے اور میں اُن سے رخصت ہوا۔ اپنی کوشش کی ناکامی پر مجھے مایوسی ضرور ہوئی لیکن حیرت نہیں۔ میں صدر کے دفتر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ مورس جیمز اُن سے ملاقات کے لیے داخل ہو رہے ہیں

اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایوب خاں کی طرف سے میرے مشورے کی نامنظوری پر توثیق کی مہر لگ گئی۔

صلح کے مذاکرات کی رفتار جیسے جیسے تیز ہوتی گئی اسی قدر ایوب خاں کا دباؤ کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ ہماری فوج کی کارروائیوں پر شروع ہی سے اعلیٰ کمان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، اُن میں اَب اضافہ ہوگیا اور کمانڈروں کو اپنے اپنے محاذ پر پیش قدمی کے جو تھوڑے بہت اختیارات حاصل تھے وہ بھی واپس لے لیئے گئے۔ فضائی فوج کی سرگرمی میں بھی کچھ کمی واقع ہو گئی تھی، اور اُن حالات میں یہ مناسب بھی تھا، کیونکہ اگر صلح جلد ہی کرنی تھی تو مزید جانوں اور سازو سامان کو داؤ پر لگانا بے سود تھا۔ راولپنڈی کے سرکاری حلقوں میں مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ اُدھر نیویارک میں جنگ سے متعلق اجلاس کا آغاز ہوا اور ادھر ہم میں سے وہ لوگ جو حالات کی رفتار سے واقف تھے، اُس اعلان کا اِنتظار کرنے لگے جو صدر ایوب نے بالآخر ۲۲ ستمبر کو نشر کیا۔ اُس دن اقوامِ متحدہ میں بھٹو نے پاکستان کی طرف سے جنگ بندی کی شرائط قبول کرنے کا اِعلان کیا اور اُس کے تھوڑے ہی دیر بعد ایوب خاں نے قوم سے خطاب کیا۔ پاکستان کے کروڑوں انسانوں نے حیرت اور غم و غصّے کے عالم میں سربراہِ مملکت کی تقریر سُنی۔ ہماری مسلح افواج میں بہت سے لوگوں کو یہ یقین تھا کہ ہم بالآخر یہ لڑائی جیت سکتے ہیں۔ اُن کا حال یہ تھا کہ صدر کی تقریر سنتے جاتے اور روتے جاتے۔ وہ اس بات پر حیرت زدہ تھے کہ جنگ ایک ایسے موڑ پر بند کر دی گئی جب دشمن کی پیش قدمی روک دی گئی تھی اور پاکستان کے لیے موثر جوابی کارروائی کا نہایت اچھا موقع تھا۔ وہ یہ پوچھ رہے تھے کہ جب ہماری فضائیہ نے ایسی فیصلہ کن کامیابی حاصل کر لی تھی تو ہم نے

اس سے فائدہ اٹھا کر جنگ کو انجام تک پہنچانے سے کیوں گریز کیا۔

ایوبؔ خاں کے خطاب میں ان سوالوں کا کچھ جواب ضرور تھا، اور اس سے بہتر جواب وہ دے بھی نہیں سکتے تھے، لیکن ان کی توجیہہ کچھ دل کو نہ لگی۔ تاہم انصاف کی بات یہ ہے کہ ایوبؔ خاں کے فیصلے میں کسی بدنیتی کو دخل نہ تھا۔ وہ جنگ بندی پر اس لیئے رضامند ہو گئے تھے کہ اُن کی نظر میں پاکستان کے تحفظ کا یہی تقاضا تھا اور اُن کا خیال تھا کہ اگر لڑائی زیادہ عرصے جاری رہی تو ملک کی سلامتی اور قوم کی عافیت خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اُن کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط، یہ تو وقت ہی بتائے گا، اور اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہوگا کہ ہندوستان اپنے پڑوسیوں کے ساتھ صلح اور اتفاق سے رہنا چاہتا ہے یا نہیں، اگر ہندوستان اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اُس کا دل بدل گیا ہے تو تاریخ ایوب خاں کے فیصلے کو حق بجانب قرار دے گی۔ اِس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کی جنگجوئی بڑھ جائے اور کچھ عرصے بعد، جب اُس کی صنعتی بنیاد زیادہ وسیع اور مضبوط ہو چکی ہو، اس کی فوجوں کے پاس زیادہ اور برتر سامانِ جنگ ہو، اور اس کے اور پاکستان کے وسائل اور فوجی قوت میں تفاوت بہت بڑھ چکا ہو، وہ پھر پاکستان پر حملہ کر دے۔ اگر آئندہ حالات نے یہ رُخ اختیار کیا تو میرے خدشے صحیح ثابت ہوں گے۔ اس صورت میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آویزش کا پہلا دور ثابت ہوگی۔

بارہواں باب

جنگ ختم ہونے کے بعد جلد ہی سوویت یونین نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی رفع کرانے کے سلسلے میں پیش دستی شروع کی۔ لیکن اس میں ایک قباحت یہ تھی کہ پچھلے چند سال میں چین اور روس کے باہمی تعلقات برابر بگڑتے چلے گئے تھے، لہذا برّصغیر کے معاملات میں سوویت یونین کی دخل اندازی چین کو ناگوار ہو سکتی تھی۔ اور وہ کسی حال میں اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔

چین کے ساتھ ہمارے تعلقات میں جو گرمجوشی تھی، اور چین نے لڑائی کے کٹھن وقت میں ہماری جو کھُل کر مدد کی تھی، اُس کا تقاضا تھا کہ چین کے مشورے کے بغیر ہم اِس علاقے کے کسی قضیے میں روس کی مداخلت قبول نہ کریں۔

اِس تقاضے کے پیشِ نظر، جب شاستری اور ایوّب خاں کی ملاقات طے پاگئی، اور اس کے لیے سوویت یونین نے میزبانی کی پیش کش کی، تو یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے صدر

ایوب کو پیکنگ جا کر چینی رہنماؤں سے ملنا چاہیئے۔ چنانچہ ایوب خاں پیکنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں غلام فاروق، بھٹو، نور خاں اور راقم الحروف اُن کے ساتھ تھے۔ پیکنگ میں چینی رہنماؤں کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر صدر لیو شاؤچی، وزیر اعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ چن ای موجود تھے۔ جنگ میں ہمارے طریقۂ عمل پر لیو شاؤچی نے نکتہ چینی کی۔ اور اس قدر کھل کر کہ چو این لائی کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ لیو شاؤچی نے بار بار اس اصول پر زور دیا کہ جب کسی ملک پر حملہ ہو تو اُس کی فوج کو جوابی کارروائی سے پہلے اس کا انتظار کرنا چاہیئے کہ حملہ آور کا زورِ حرکت (Momentum) ٹوٹ جائے، اور پھر اپنے معیّن کیے ہوئے وقت اور مقام پر جوابی حملے کا آغاز کرنا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان نے جوابی حملے میں عجلت کر کے غلطی کی۔

اس کے بعد انھوں نے جنگ میں طریقِ عمل کے موضوع پر چیئرمین ماؤزے تنگ کے نظریئے کی تشریح پیش کی۔ ایوب خاں یہ باتیں سُن کر خوش تو نہ ہوئے لیکن انھوں نے لیو شاؤچی کی گفتگو بڑے غور سے سُنی۔

میں اس ضیافت میں مارشل چن ای کے بازو میں بیٹھا تھا۔ جو چین کے وزیر خارجہ تھے۔ اس سے قبل ایک مرتبہ میں نے بھٹو سے پوچھا تھا کہ انھوں نے جنگ سے پہلے یہ انتہائی غلط اندازہ کیونکر لگایا تھا کہ اگر پاکستان نے کشمیر میں جنگ بندی لائن توڑ دی تو ہندستان اُس کے جواب میں ہماری بین الاقوامی سرحدوں پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس پر بھٹو نے اُس گفتگو کا حوالہ دیا جو اُن کے اور مارشل چن ای کے درمیان پہلی یا دوسری ستمبر کو کراچی کے ہوائی اڈے پر ہوتی تھی، جہاں چن ای پیرس جاتے ہوئے تھوڑی دیر کو ٹھہرے تھے۔ بھٹو کے بیان کے

مطابق اُنھوں نے مارشل موصوف سے یہ پوچھا تھا کہ اگر پاکستان کشمیر میں جنگ بندی لائن توڑ کر مقبوضہ علاقے پر حملہ کرے تو کیا ہندوستان بین الاقوامی سرحد کو پار کر کے پنجاب پر حملہ کر دے گا۔ اور بقول بھٹو چن ای نے جواب دیا تھا کہ اُن کے خیال میں ہندوستان بین الاقوامی سرحد کو نہ توڑے گا، لہٰذا پاکستان بلا کھٹکے چھمب اور جوڑیاں کے علاقے میں اپنا حملہ جاری رکھ سکتا ہے۔ اِس اندازے کے پیشِ نظر بھٹو اور عزیز احمد نے ایوب خاں کو یقین دلا دیا تھا کہ ہندوستان جوابی حملہ نہیں کرے گا۔

یہ تو شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ بھٹو کا بیان کہاں تک صحیح تھا اور چن ای نے واقعی اُن سے کیا کہا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اِس گفتگو کی جو روداد ایوّب خاں کو اپنے وزیر خارجہ سے ملی اُس نے ان کی رائے کو متاثر کیا ہوگا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یکم اور چھٹی ستمبر کے درمیان نازک عرصے میں جنگ بندی لائن کے اُس پار پاکستان کی جارحانہ کارروائیوں میں جو تیزی ہوئی اُس کی ایک وجہ وہ اطمینان تھا جو ایوّب خاں کو بھٹو کی روداد سُن کر حاصل ہوا ہوگا۔

چن ای پاکستان کے مخلص دوست تھے اور بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیوں پر گہری نظر رکھتے تھے، لہٰذا میں یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اُنھوں نے صورتِ حال کا واقعی وہی اندازہ لگایا تھا جو ذوالفقار علی بھٹو نے اُن سے منسوب کیا۔ اور جو کسی سادہ لوح شخص کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ اُن دنوں کے بعد بھٹو کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ اُنھوں نے مارشل چن ای سے اپنی ملاقات کو عمداً اِس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ ایوّب خاں کو مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کا حملہ جاری رکھنے پر آمادہ کریں۔

بھٹو کو فوجی معاملات کی زیادہ سمجھ نہیں تھی، لیکن میرے خیال میں انھیں اس بات کا پوری طرح اندازہ تھا کہ اگر جنگ بندی لائن کے پار ہمارا جارحانہ حملہ جاری رہا تو ہماری سرحدوں پر ہندوستان کی جوابی کارروائی ناگزیر ہو جائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر انھوں نے جان بوجھ کر ایوب خاں کو گمراہ کیوں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے یہ اس اُمید پر کیا کہ جنگ میں پاکستان کو شکست ہو جائے گی اور اس کے باعث ایوب خاں کا تختہ اُلٹ جائے گا۔ پھر ملک میں جو افراتفری ہوگی اُس میں ذوالفقار علی بھٹو ہی ہندوستان سے سمجھوتے کی بات چیت کر سکیں گے، اور پھر بالآخر وہی ایوب خاں کی جگہ صدارت کا منصب سنبھال سکیں گے۔ آج میں ماضی کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو جنگ سے چند دن پہلے اور اس کے دوران مسٹر بھٹو کے رویّے کے پیشِ نظر مجھے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ انھوں نے عمداً ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جن میں وہ خود اقتدار حاصل کر سکیں۔ اُس وقت تو اُنھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی، لیکن چھ سال بعد انھوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ ۱۹۷۱ء میں جب بھٹو دوبارہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ مقرر ہوئے، ملک کو ہندوستان سے دوسری جنگ میں شکست ہوئی اور یحییٰ خاں کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔ اور دُنیا نے یہ طرفہ تماشا دیکھا کہ ایک غیر فوجی شخص بیک وقت پاکستان کا صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوا۔ اِس غیر معمولی عمل میں ملک کا ایک حصّہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا، لیکن یہ المیہ بھٹو کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

سوویت یونین کی پیش کش کے متعلق ایوب خاں اور چینی رہناؤں کی گفتگو میری موجودگی میں نہیں ہوئی، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ چینیوں نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا تاہم انھوں نے ایوب خاں کو متنبہ کیا کہ سوویت یونین صورتِ حال کو اپنا کام نکالنے کے لیے

استعمال کرنے کی کوشش کرے گا اور اُس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اِس موقع پر اور اِس سے پہلے چینیوں سے میری جتنی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں اُن میں بین الاقوامی معاملات میں چین کی شائستگی سے بہت متاثر ہوا۔ ہمارے ساتھ بات چیت میں اُنھوں نے کبھی امریکہ سے ہمارے قریبی تعلقات، یا "سیٹو" میں ہماری شرکت پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ایوّب خاں نے پاکستان کی "سیٹو" سے وابستگی کا ذِکر کچھ شرمندگی کے ساتھ کیا تو چو این لائی نے انھیں یقین دلایا کہ چین کو پاکستان کے مفاد کا بھی اِتنا ہی لحاظ ہے جتنا خود اپنے مفاد کا۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ اگر پاکستان "سیٹو" سے وابستگی اپنے حق میں مفید سمجھتا ہے تو چین کو اِس پر کوئی اعتراض نہیں۔ پھر انھوں نے مزاحاً یہ بھی کہا کہ چین کے لئے یہ اچّھا ہے کہ "سیٹو" میں بھی اس کا ایک دوست ملک موجود ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ چونکہ چین خود بھاری سامانِ جنگ پاکستان کو فراہم نہیں کر سکتا اس لیے پاکستان کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ وہ یہ سامان امریکہ سے حاصل کرتا رہے۔

چین کے اِس دورے سے ہمارا یہ یقین پکّا ہو گیا کہ اُس کے ساتھ ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اِس علاقے کے مسائل کے بارے میں چینی رہنماؤں نے ہماری طرف جس دوستانہ رویّہ کا اظہار کیا اور جو کار آمد طرزِ عمل اختیار کیا، ہم اُس سے بہت متاثر ہو کر وطن لوٹے۔

تیرہواں باب

۲۳ ستمبر کو جب جنگ بندی ہوئی تو دونوں حریفوں کے قبضے میں ایک دوسرے کے بہت سے علاقے رہ گئے۔ اس کے علاوہ وہ متعدد تجارتی جہاز اور بہت سا تجارتی مال بھی تھا جو دونوں نے جنگ کے دوران پکڑ لیا تھا۔ ایک دوسرے کی سرزمین کے اوپر سے ہوائی جہازوں کی ملکی اور بین الاقوامی پروازیں معطل تھیں اور باہمی تجارت رُکی ہوئی تھی۔ لہٰذا اب اس کی ضرورت تھی کہ مستقل امن کے لئے فریقین میں مذاکرات ہوں اور تعلقات معمول کے مطابق بحال ہو جائیں۔ دونوں اس بات پر رضامند ہو گئے کہ یہ مذاکرات سکریٹریوں یا وزیروں کے درمیان نہیں بلکہ دونوں حکومتوں کے سربراہوں کے مابین ہوں دونوں نے اس کے لیے سوویت یونین کی میزبانی کی پیش کش قبول کرلی۔ اور یہ طے پایا کہ صدر پاکستان اور وزیر اعظم ہند کی ملاقات تاشقند میں ہو۔ ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو دونوں ملکوں کے وفد وہاں پہنچے تو روسی وزیر اعظم کوسیجن نے اعلیٰ مشیروں کی ایک جماعت کے

ساتھ اُن کا استقبال کیا۔ مذاکرات آٹھ دن تک جاری رہے اور اس تمام عرصے میں مسٹر کوسیجن تاشقند ہی میں ٹھہرے رہے۔

جنگ بند ہونے کے بعد امن کے لیئے باقاعدہ مذاکرات بہرحال ناگزیر تھے۔ پھر ہندوستانی فوجیں لاہور اور سیالکوٹ کے قریب ہماری سرزمین کے بعض اہم علاقوں پر قابض تھیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس ہندوستان کا زیادہ رقبہ تھا۔ مگر اس کا بیشتر حصّہ سندھ سے ملحق راجپوتانے کے ریگستان میں واقع تھا۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے ہمارے لیے یہ بات باعث توہین تھی کہ لاہور اور سیالکوٹ کے نواح سے صرف چھ سات میل دور پاکستان کا کچھ رقبہ ہندوستان کے قبضہ میں تھا۔ لہٰذا صدر ایوّب اس عزم کے ساتھ تاشقند گئے تھے کہ وہ ہندوستان کو اپنی فوجیں لاہور اور سیالکوٹ کے محاذ سے بین الاقوامی سرحد پر واپس لے جانے پر رضامند کریں۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی اختلافات سے روس کی دلچسپی پاکستان کے حق میں مفید ثابت ہوگی، کیونکہ ثالث کی حیثیت سے روس اِس بات پر مجبور ہوگا کہ وہ اِن اختلافات میں زیادہ غیر جانبداری سے کام لے۔ انھیں یہ اُمید تھی شاید سوویت یونین کی موجودگی کی وجہ سے ہندوستانی رہنما ہندو پاکستان کے مسائل خصوصاً مسئلہ کشمیر کے متعلق زیادہ معقول طرزِ عمل اختیار کریں گے۔

سوویت یونین نے شروع ہی میں یہ واضح کردیا تھا کہ وہ ہندوپاکستان کے اِن مذاکرات میں براہِ راست شریک نہ ہوگا۔ اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دونوں فریقوں کو اپنے اختلافات بات چیت کے ذریعے طے کرنے کا موقع مل جائے۔ ہاں اگر فریقین کو روس سے کسی مشورے یا مدد کی ضرورت ہو تو وہ انھیں حاصل ہوگی۔ چنانچہ مذاکرات زیادہ تر

ہندوپاکستان کے وفود کے درمیان ہوئے اور سوویت یونین کا کوئی نمائندہ اُن میں شریک نہیں ہوا کبھی دونوں فریقوں کے سربراہوں نے براہِ راست بات چیت کی، اور کبھی اُن کے وزرائے خارجہ نے۔ ان باہمی ملاقاتوں کے بعد دونوں فریق الگ الگ روس کے نمائندوں سے ملتے، انھیں مذاکرات کی رفتار سے آگاہ رکھتے اور کوشش کرتے کہ وہ اُن کے حق میں فریق مخالف کو زیادہ معقول رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کرے۔ پاکستان کو اپنی جگہ یہ اُمید تھی کہ وہ ان مذاکرات میں اُس بنیادی مسئلے کو حل کرانے کی کوشش کرے گا جس کی وجہ سے بّرِصغیر کی تقسیم کے بعد سے ہندو پاکستان میں برابر آویزش جاری تھی۔ چنانچہ پاکستان نے اصرار کیا کہ مسئلہ کشمیر پر بھی بحث ہو۔ دوسری طرف ہندوستان نے بھی اِس بارے میں سخت رّویہ اختیار کیا اور اس مسئلے پر گفتگو کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے نمائندوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ تاشقند میں مذاکرات پر صرف اِس لئے آمادہ ہوئے تھے کہ وہاں ان مسئلوں پر بات چیت کی جائے جو ستمبر کی جنگ سے پیدا ہوئے تھے، اِس لیے نہیں کہ پاکستان کو ایک ایسا مسئلہ دوبارہ چھیڑنے کا موقع دیا جائے جو ہندوستان کی نظر میں بہت پہلے طے ہو چکا تھا۔ بہرحال بعد میں، سوویت رہنماؤں کے سمجھانے بُجھانے پر وہ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

لیکن جب بات چیت شروع ہوئی تو جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ ہندوستان اس مسئلہ پر اپنے بنیادی موقف میں کسی ترمیم پر تیّار نہیں، چنانچہ مذاکرات میں تعطل سا پیدا ہو گیا۔ تاہم چونکہ فریقین میں اِس بات پر اتفاق تھا کہ جنگ سے پیدا ہونے والے مسئلے بہرحال طے ہونے چاہئیں اس لیے معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقے چھوڑنے اور جنگی قیدیوں کے تبادلے پر بات چیت آگے بڑھے گی۔ تین چار دن کی گفتگو کے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ تاشقند میں

زیادہ عرصہ قیام کرنے سے صورتِ حال میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوگی۔

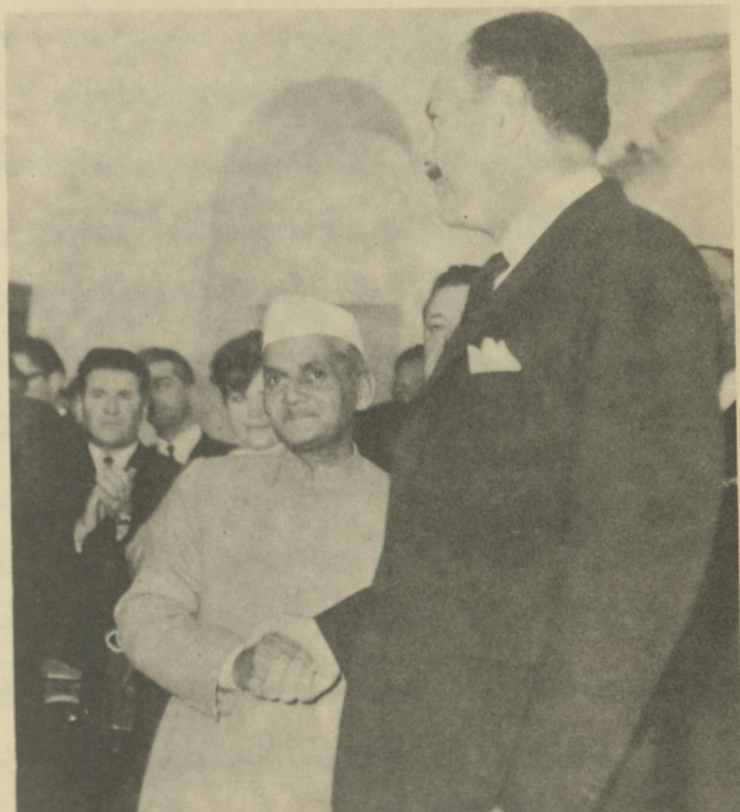
صدر ایوّب کو اس بات کا احساس تھا کہ روسی رہنماؤں نے دونوں فریقوں کو یکجا کرنے کے لیے کتنی کوشش کی تھی، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر پاکستان اپنی بات پر اڑا رہا اور اس نے ہندوستان سے سمجھوتے کے لیے کوئی قدم نہ بڑھایا تو اس سے ہمارے روسی میزبانوں کو خفّت ہوگی۔ تاشقند میں ہندوستان اور پاکستان وفود کے اعزاز میں جتنی ضیافتیں ہوئی تھیں اُن سب میں سوویت یونین کے اعلیٰ ترین عہدے دار استقبال کو موجود ہوتے تھے اور ان میں وزیرِ دفاع، مارشل میلونا وسکی اور اُن کے نائب مارشل سوکو لوفسکی بھی شامل ہوتے تھے۔ وزیرِ اعظم کوسیجن فریقین کو اپنے باہمی مسائل حل کرنے میں جو مدد دے رہے تھے اُس پر صدر ایوب ان کے ممنون تھے اور اس غیر معمولی پذیرائی سے اُن کا احساسِ ممنونیت بڑھتا رہا۔ مذاکرات جتنا طول پکڑتے جا رہے تھے اسی قدر ایوّب خاں یہ سوچ سوچ کر شرمندہ ہوتے تھے کہ روسی رہنما ہندوستان اور پاکستان کی خاطر ماسکو میں اپنا روزمرہ کا کام چھوڑ کر تاشقند میں رُکے ہوئے ہیں۔ پھر تاشقند کے لوگوں کا روّیہ اپنے مہمانوں کی طرف نہایت دوستانہ تھا اور ہمارے میزبان مذاکرات کی کامیابی کے لیے واقعی بے چین نظر آتے تھے۔ اِن باتوں کا اثر بھی ایوّب خاں پر ہوا اور اُن کے روّیے میں زیادہ لچک پیدا ہوگئی۔ اُدھر ایک ہفتے کی بات چیت کے بعد ہندوستان کا روّیہ بھی نسبتاً زیادہ معقول معلوم ہوا، گو کہ اس دوران اس کے موقف میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

اِن تمام واقعات کا مجموعی اثر ایوّب خاں پر یہ ہوا کہ وہ مذاکرات میں سخت روّیہ اختیار کرنے کے خلاف ہوگئے، اور اپنے وفد کے اُن ارکان پر اُن کی تنقید بڑھنے لگی جو اس

پر مُنحصر تھے کہ پاکستان اپنی بات پر اَڑا رہے۔ انجامِ کار جب یہ ظاہر ہوگیا کہ مذاکرات میں مزید پیش رفت ممکن نہیں تو یہ طے ہوا کہ ایک مشترکہ اعلان تیار کیا جائے۔ چنانچہ مذاکرات کے آخری چند دن اُس دستاویز کی تکمیل میں صرف ہوئے جس پر بعد میں پاکستان میں اس قدر بحثا بحثی اور لے دے ہوئی۔

شاستری کی تجویز پر یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں ملکوں کے بّری سپہ سالار مل کر فوجوں کے انخلاء کی تفصیلات طے کریں، اور ایوّب خاں نے تجویز کیا کہ بحری اور فضائی افواج کے سپہ سالار اپنے باہمی معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے یکجا ہوں۔ دونوں فریقوں میں اس بات پر اُصولی سمجھوتہ تو ہو ہی چکا تھا کہ اُن کی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں پر واپس چلی جائیں، اب یہ بھی طے ہوگیا کہ جلد ہی جنگ سے پیدا ہونے والے باقی مسئلوں کو سلجھانے کے لیے دونوں ملکوں کے متعلقہ وزیروں کی ملاقات ہو۔

تاشقند کے اِعلان پر ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو اِتفاق ہوگیا اور اُسی دن اُس کا متن اخباروں اور ٹیلیویژن کے بڑے بین الاقوامی اجتماع کے سامنے پڑھ کر سُنایا گیا۔ یہ کارروائی بڑے ڈرامائی ماحول میں انجام دی گئی اور روسیوں نے اِعلان کی تشہیر کا جو اہتمام کیا تھا اس نے گویا ایک تھیٹر کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں پر اس اِعلان کے جو متضاد اثرات ہوئے وہ ان کے چہروں سے صاف عیاں تھے۔ ہندوستانی مسرور اور متبسّم تھے اور اس کے برعکس پاکستانی نمائندے سب کے سب اُداس اور مایوس نظر آرہے تھے۔ اگر یہ اظہار فریقین کے جذبات اور رَدِّ عمل کا صحیح آئینہ دار تھا تو اعلان تاشقند پاکستان کی طرف سے اِعتراف شکست تھا۔ دراصل ہر پاکستانی اس وقت یہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کے



معاہدۂ تاشقند پر دستخط کے بعد پاکستان کے صدر محمد ایوب خاں، بھارتی وزیراعظم
لال بہادر شاستری سے مصافحہ کرتے ہوئے

ملک نے حق اور انصاف کی خاطر یہ لڑائی لڑی تھی۔ پھر اُسے اپنی سادہ لوحی کے باعث یہ یقین بھی تھا کہ بڑی طاقتیں اپنا اثر اور اقتدار اُس فریق کے حق میں استعمال کریں گی جو بین الاقوامی معاملات میں انصاف اور اخلاقی اصولوں کی بالادستی کے لیے لڑ رہا تھا۔ اِعلان تاشقند پر پاکستانی نمائندوں کا ردِّ عمل اِسی کیفیت کا غمّاز تھا۔ آزاد قوم کی حیثیت سے پاکستان کی عمر ابھی صرف اُنیس سال کی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک اس نے یہ سبق نہیں سیکھا کہ بین الاقوامی سیاست بڑی بے رحم ہے اور اُس کی حقیقتیں انتہائی تلخ ہیں۔ پاکستانی نمائندوں کے برعکس شاستری کھِلے جا رہے تھے اور چہک رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے دوسرے رُکن سارے کمرے پر چھائے ہوئے تھے اور جو سامنے آتا اس سے جھٹ مصافحہ کر لیتے۔ ان کے سرور و انبساط کا یہ عالم تھا کہ گویا ہندوستان نے بین الاقوامی ہاکی میں پاکستان کو شکست دی ہے۔

اِعلان کے چند گھنٹے بعد جب وزیر اعظم کوسیجن کے عشائیے میں سب لوگ پھر جمع ہوئے تو اسی قسم کا منظر ایک دفعہ اور دیکھنے میں آیا۔ سب مہمان کمرے میں گھوم پھر رہے تھے اور ہندوستانی ہمیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم سے مل رہے تھے۔ اُس سے پہلے مذاکرات کے دوران ہفتے بھر وہ ہمیں بڑی سرد مہری سے گھورا کرتے اور بات چیت برائے نام ہی کرتے تھے لیکن اُس شب وہ بڑی دل نوازی سے بڑھ بڑھ کر ہم سے مِل رہے تھے۔ کھانے کے فوراً بعد صدر ایوّب نے، جو اُس وقت شاستری سے محوِ گفتگو تھے، مجھے اپنے پاس بُلایا اور اُن سے میرا تعارف کرایا۔ پھر ایوّب خاں نے مجھے بتایا کہ اگلے دن شاستری کابل پرواز کریں گے اور وہاں سے دو ایک روز بعد دہلی واپس چلے جائیں گے۔ چونکہ اُس زمانے میں پاکستانی سرزمین کے اُوپر سے ہندوستانی طیّاروں کی پروازیں معطل تھیں لہذا

شاستری کا ارادہ تھا کہ واپسی میں وہ ایران کے اُوپر سے پرواز کریں اور بلوچستان کے ساحل کے جنوب میں مغربی پاکستان کے گرد ہوتے ہوئے ہندوستان کا سفر کریں۔ اُن کو اس طویل سفر کی زحمت سے بچانے کے لیے ایوبّ خاں نے مجھ سے کہا کہ شاستری کی کابل سے دہلی براہِ راست پرواز کا بندوبست کروں، اور شاستری کو دعوت دی کہ وہ واپسی میں کچھ دیر راولپنڈی ٹھہریں۔ شاستری نے کہا کہ وہ اس کی کوشش کریں گے، اور کابل سے دہلی براہِ راست سفر کی اجازت پر ممنون ہوئے۔ جب ایوبّ خاں مجھ سے اس سفر کے اہتمام کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، شاستری نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اس سے پہلے شاید کبھی کسی نے مجھ سے اتنا طویل اور پرزور مصافحہ نہ کیا ہوگا۔ ایوبّ خاں نے اپنی بات ختم کی تو گویا مجھے اپنا ہاتھ شاستری کی گرفت سے چھڑانے کا موقع ملا اور میں نے عرض کیا کہ اب مجھے ضروری انتظامات کے لیے کراچی پیغام بھیجنا چاہیئے۔ اس کے بعد بھی شاستری ہشاش بشاش اپنے گردوپیش دوسرے مہمانوں سے بات چیت کرتے رہے اور میں نے دیکھا کہ ہمارے وفد کے جن ارکان کا اُن سے تعارف کرایا گیا اُن سے وہ بہ ظاہر بڑی گرمجوشی اور شفقت سے ملتے رہے۔ رات کے دس بجے جب وہ رخصت ہوئے تو کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ ہوگا کہ شاستری سے یہ آخری ملاقات ہے۔

صدر ایوبّ کے علاوہ، جو ایک علیحدہ بنگلے میں ٹھہرائے گئے تھے، ہمارا وفد ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مقیم تھا۔ شاستری کے رخصت ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب وہاں لوٹ گئے اور گیارہ بجے کے قریب سونے چلے گئے۔ کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا کہ ایک شور سے یکایک میری آنکھ کھُل گئی۔ میں اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھا تو دیکھا کہ روشنی جل رہی ہے

اور میرے پلنگ کے گرد چار آدمی کھڑے ہیں، تین روسی اور چوتھے ذوالفقار علی بھٹو۔ روسی حضرات تو باقاعدہ لباس میں تھے لیکن بھٹو نے شب خوابی کے کپڑے پہن رکھے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سوتے سے اُٹھائے گئے ہیں۔ میں نے حیرت سے نیم خوابی کے عالم میں اِن لوگوں پر نظر ڈالی، اور معاً ایک روسی نے جس سے میں قیامِ تاشقند کے دوران مِل چکا تھا اور دہلی میں سوویت سفیر کی حیثیت سے پہچانتا تھا، اپنی زبان میں تقریر شروع کردی۔ وہ بول رہا تھا اور میں حیرت سے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ ہنگامہ کیا ہے۔ روسی سفیر کی تقریر کے دوران دوسرا روسی جو ترجمان تھا، ایک کتاب میں اُس کی تقریر کے الفاظ لکھتا رہا۔ تقریر ختم ہوتی تو قبل اس کے کہ ترجمان کچھ کہے، بھٹو نے اعلان کیا: "شاستری رحلت کر گئے۔" پھر ترجمان نے بتایا کہ شاستری اپنے بنگلے واپس پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی یکایک انتقال کر گئے اور اسی صبح اُن کی میّت طیّارے کے ذریعے دہلی بھیجی جائے گی۔ تاشقند سے نئی دہلی براہِ راست پرواز کو مغربی پاکستان کی سرزمین کے اُوپر سے گذرنا پڑتا، اور روسی حضرات میرے پاس اس لیئے آئے تھے کہ میں اُس سفر کے لیئے، جس میں میّت بردار طیّارے کے ساتھ ایک اور جہاز بھی جاتا تھا، پاکستان سے ضروری اجازت حاصل کروں۔

اِس کے بعد ایک گھنٹے تک میں روسی سفیر کے ساتھ ہوٹل کے استقبالیہ کمرے میں رہا اور یہ کوشش کرتا رہا کہ پاکستان میں کسی سے رابطہ قائم کروں تاکہ یہ دونوں طیّارے ہماری سرزمین کے اُوپر سے پرواز کر کے براہِ راست دہلی جا سکیں۔ کانفرنس کے لیئے تاشقند سے کراچی تک اور تاشقند سے دہلی ٹیلیفون کے رابطوں کے خصوصی انتظامات کیئے گئے تھے، لہذا میں بالآخر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ چکلالہ (راولپنڈی) میں فضائیہ کے اسٹیشن

کمانڈر سے میری بات ہوگئی اور میں نے انھیں ضروری ہدایات پہنچا دیں۔

اس المناک سفر کے آغاز کے متعلق یہ طے ہوا تھا کہ میّت بردار طیارہ آٹھ بجے صبح روانہ ہوگا، اور ہم سب کو ساڑھے سات بجے ہوائی اڈّے پر پہنچنا تھا۔ اُس دن باہر کڑاکے کی سردی تھی اور پارہ نقطۂ انجماد سے بہت نیچے گر چکا تھا، مگر جب ہم تاشقند کی سڑکوں پر سے گذرے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے سویرے، اور باوجود اس کے کہ اس سانحہ کو ابھی چند ہی گھنٹے گذرے تھے، سڑکوں کے دونوں جانب سوگواروں کے ہجوم قطار اندر قطار خاموش کھڑے ہیں بعض جگہوں پر تو ان قطاروں کی تعداد دس دس تک پہنچ گئی تھی۔

سابق پروگرام کے مطابق شاستری کو دن چڑھتے تاشقند سے روانہ ہونا تھا، اب اُن کی میت کی روانگی سویرے ہو رہی تھی اور بظاہر اس تبدیلی کی اطلاع شہر کے لوگوں کو پچھلے پہر ہوگئی تھی۔ ایوّب خاں کو شاستری کی موت کی اطلاع علی الصبح دی گئی تھی۔ وہ تعزیت کے لیے پہلے اُن کے بنگلے گئے اور پھر ہوائی اڈّے پہنچے لیکن جنازے کے جلوس کو روانہ ہونے میں بہت دیر ہوئی اور وہ قریب دس بجے ایئرپورٹ پہنچا۔ اُس کے بعد فوجی اعزاز کی رسمیں ادا ہوئیں اور پھر میّت کو ایک توپ بردار گاڑی میں سوگوار اکابر کی صف کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ اُس کے پاس ہی اُس ہوائی جہاز کی سیڑھیاں تھیں جو میّت کو لے کر دہلی جانے والا تھا۔

جنازے کے محافظ سپاہی کنارے ہٹے تو وزیراعظم کوسیجن اور دوسرے روسی زعماء میّت کو آگے لے جانے کے لئے بڑھے کوسیجن نے چلتے ہوئے ایوّب خاں پر نظر ڈالی جو اُن کے بازو میں کھڑے تھے۔ تابوت کو پہلے کوسیجن نے کندھا دیا، پھر ایوّب خاں نے، اور



پاکستان کے سابق صدر ایوب خاں اور روسی وزیراعظم الیکسی کوسیجن
بھارتی وزیراعظم آنجہانی شاستری کے جنازے کو کاندھا دیتے ہوئے

اِس طرح فتحمند لال بہادر شاستری کی میت آہستہ آہستہ ایئر انڈیا کے بوئنگ کی سیڑھیوں تک پہنچائی گئی۔ اُن کے آخری قدم پر ہندوستانی وفد کے ارکان اور جہاز کے عملے نے تابوت سنبھال لیا اور اسے جہاز کے اندر لے گئے۔ یہ منظر بڑا رقت انگیز تھا، پھر سانحہ اِتنا اچانک اور ایسے موقع پر پیش آیا تھا، کہ اُس سے موت کا صدمہ اور شدید ہوگیا تھا۔ جن لوگوں نے شاستری کی میت طیارے تک پہنچائی، اُن میں ہندوستان کے وزیر دفاع چوان بھی تھے، جن کے متعلق کہا جارہا تھا کہ اب وہ وزیر اعظم ہوں گے۔

سیڑھی کے آخری قدموں پر میت بردار چند لمحوں کے لیے رُکے تو ایوّب خاں چوان کی طرف بڑھے اور جذبات سے مغلوب ہو کر یا دانستہ اُن کی دلجوئی کی خاطر، اُن سے گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے، لیکن چوان پر اس کا بظاہر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بےحس و حرکت ہاتھ چھوڑے کھڑے رہے۔ ہم میں سے جس جس نے یہ افسوسناک منظر دیکھا اُسے محسوس ہوا کہ یہ پاکستان کی بدنصیبی کی انتہا ہے۔ معانقے کے لیے ایوّب خاں کی پیش قدمی، اور اُس کے جواب میں چوان کی بےحسی اور سردمہری گویا دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی کیفیت کی آئینہ دار تھیں اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان کے تکبّر اور اُس کی توسیع پسندی کے آگے ایوّب خاں کی دوستی کی کوششیں بےسود ہیں۔

اَب میں، تاشقند کے مذاکرات اور معاہدے کا خیال کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اُس کی اہمیت کے اندازے میں بہت مُبالغہ سے کام لیا گیا۔ کچھ لوگوں نے اسے ملک کے لیے ایک بڑی فتح قرار دیا، اس کے برعکس دوسروں نے کہا کہ معاہدہ قبول کر کے حکومت نے پاکستان کے قومی مفاد کا سودا کر لیا ہے۔ حکومت کے مخالفوں نے معاہدے کی

مذمت کی اور اُس کے حامیوں نے اُسے سراہا۔

تاشقند کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان و پاکستان کے تعلقات میں سوویت یونین پہلی دفعہ دخل انداز ہوا اور اس سے کچھ اصلاحِ احوال کی بھی صورت پیدا ہوئی۔ تاشقند کی ایک اور اہمیت یہ تھی کہ وہ روس اور پاکستان کے باہمی تعلقات کے ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ یہ تعلقات ہمارے لیے نہایت اہم ہیں، اور اگر دوسری تمام باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو صرف جغرافیائی قرب کا تقاضا یہ ہے کہ آئندہ یہ تعلقات مزید بہتر ہوتے رہیں۔ اس میں دونوں ملکوں کا فائدہ ہے۔

اِس کے برعکس ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کے نقطۂ نظر سے یہ معاہدہ کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا، تاہم اس سے یہ ضرور ہوا کہ جنگ بندی کے بعد دونوں حریفوں کو اپنے تعلقات معمول پر لانے اور امن کی صورت بحال کرنے میں بڑی مدد ملی۔

اِس کے علاوہ تاشقند کے مذاکرات سے ہمارے اِس اندازے کی بھی تصدیق ہوگئی کہ بنیادی معاملات پر ہندوستان کے نقطۂ نظر اور عزائم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اِس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ وطن کی سلامتی اور عزت کی صرف ایک ضمانت ہے، اور وہ ہے ایک مضبوط پاکستان، جسے اپنی ذمے داریوں اور اپنے گِرد و پیش کے خطروں کا پورا احساس ہو۔ اگلے بیس تیس برس میں برِصغیر میں حالات و واقعات کی رفتار بہت کچھ اِس بات پر منحصر ہوگی کہ ہم نے یہ سبق یاد رکھا، اور اس کے تقاضے پورے کیئے، یا نہیں، اور اِسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پاکستان اپنا اصل نصب العین

حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ یہ نصب العین اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستان ایک مضبوط اور صحیح معنوں میں آزاد مملکت ہو، اپنے عزم میں متحد ہو اور اِس کی صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ جن کروڑوں انسانوں کی آرزؤں اور اُمیدوں کا مظہر ہے، ان کی آزادی اور خوش حالی کی ضمانت بھی دے سکے۔

ضمیمہ (الف)

ہر ملک کو چند خاص نوعیت کے مسئلوں کا سامنا ہوتا ہے جن کی اہمیت کو پوری طرح وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ اُس کی سلامتی کو جو خطرے درپیش ہوتے ہیں اُن کی اہمیت جس طرح وہ خود محسوس کرتا ہے دوسرے ملک اکثر نہیں کر سکتے اس ضمن میں مجھے وہ گفتگو یاد آئی جو چند برس ہوئے صومالی فوج کے ایک کمانڈر اور میرے درمیان ہوئی۔ یہ یہ افسر اُن دنوں پاکستان آیا تھا جب شمال مغربی سرحد پر باجوڑ کے علاقے میں ہماری افغانستان سے جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ میں اُس سے باتیں کرتے ہوئے لاعلمی میں یہ کہہ گیا کہ میرا خیال ہے کہ صومالیہ کا سرحدوں کی بابت اپنے پڑوسیوں سے کوئی تنازعہ نہیں، اور اگر واقعی ایسا ہے تو یہ اُس کی خوش نصیبی ہے۔ صومالی کو اس بات پر بہت تعجب ہوا۔ اُس نے مجھے حبش کے ساتھ صومالیہ کے جھگڑے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کے باعث اُن کا ملک ایک سنگین

(لندن کے (Institute of Strategic Studies) میں ایک گفتگو، ۶ مئی ۱۹۶۵ء)

سرحدی جھگڑے سے دوچار ہے۔

اِس مثال سے محض یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ صرف پاکستان ہی کو سلامتی کا مسئلہ درپیش نہیں، بہت سے دوسرے ملکوں کو بھی اسی قسم کے مسئلوں کا سامنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے دفاعی مسئلے کے چند پہلو ہمارے ملک کی صورتِ حال کے مطابق ہیں، اور میں اس گفتگو میں اُنہی پہلوؤں کی وضاحت کروں گا۔

پاکستان کے نقشے پر چند خط و خال نہایت نمایاں نظر آتے ہیں اور اُن کے بعض پہلو نہایت دلچسپ ہیں۔ سب سے زیادہ نمایاں چیز تو یہ ہے کہ ملک دو غیر متصل حصوں میں بنا ہوا ہے جن کے درمیان ایک نامہربان پڑوسی کا تقریباً بارہ سو میل لمبا علاقہ حائل ہے۔ ہم اپنے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان برّی مواصلات کا کوئی ایسا نظام قائم نہیں کر سکتے جو اس غیر علاقے سے گذرتا ہو۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمارا ملک ایشیا کے دو سب سے طاقتور ملکوں، یعنی چین اور ہندوستان سے متصل ہے اور ہماری اور اُن کی سرحدیں مشترک ہیں۔ ہماری ایک اور مشکل یہ ہے کہ پاکستان کی صنعتی ترقی ابھی اس مرحلے پر نہیں پہنچی کہ ہم ملکی دفاع پر اتنا خرچ اُٹھا سکیں جو ہمارے جغرافیائی وقوع اور ہماری دفاعی ذمے داریوں کا تقاضا ہے۔

اس پس منظر میں ہم اپنے دفاع کے مسائل اور اپنے اہم پڑوسیوں سے اپنے تعلقات کا مختصر جائزہ لیں گے اور پھر اُن ذمے داریوں پر غور کریں گے جن سے ہماری مسلح افواج کو عہدہ برآ ہونا ہے۔

مغرب میں ہماری سرحد ایران سے ملتی ہے جس سے ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔ اس سرحد کی باقاعدہ نشان دہی ہو چکی ہے اور پاکستان اور ایران کے درمیان کسی قسم کا کوئی تنازعہ یا مسئلہ نہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں ہمارا ملک ایران اور ترکی کے ساتھ "سینٹو" میں شامل ہے اور ہر سال دو مرتبہ ہم ان دونوں کے ساتھ فضائی مشقوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان تینوں ملکوں کی مسلح افواج کے افسر اکثر مشترک مسائل کے مطالعے اور ان پر تبادلۂ خیال کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور ان کے اسٹاف افسروں کے مشترک اجلاس بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ یہ رابطے ہماری افواج کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ یہ آئندہ بھی جاری رہیں گے اور ان سے تینوں شریک ملکوں کو فائدہ ہوگا۔

بدقسمتی سے ہمارے دوسرے پڑوسی افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات مختلف مرحلوں سے گذرے ہیں، اور پچھلے ایک سال میں پہلے کی نسبت خاصے بہتر ہوئے ہیں۔ سفارتی تعلقات بحال ہو گئے ہیں اور نئے تجارتی معاہدوں پر دستخط ہوئے ہیں۔ صورتِ حال اب فی الجملہ بہت بہتر ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ حالات روبہ اصلاح رہیں گے۔ افغانستان کے ساتھ تعلقات میں اصل دقت یہ ہے کہ افغان حکومت وقتاً فوقتاً یہ مطالبہ کرتی رہی ہے کہ مغربی پاکستان کے مغربی علاقوں کے باشندوں کو کسی نہ کسی شکل میں خودمختاری دے دی جائے۔ اِن علاقوں کی کوئی واضح نشان دہی تو کبھی نہیں کی گئی، لیکن عموماً یہ کہا گیا ہے کہ ان سے مُراد وہ علاقہ ہے جو دریائے سندھ کے مغرب میں واقع ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے صورتِ حال یہ ہے کہ افغانستان کی مسلح افواج روسی ہتھیاروں اور ساز و سامان سے

لیس ہیں، اور تعداد میں اس کی بّری اور فضائی دونوں فوجیں پاکستان کے قریب قریب برابر ہیں۔

سوویت یونین سے ہماری سرحد متصل نہیں، تاہم اس کی سرزمین مغربی پاکستان کے شمالی حصے سے بہت قریب ہے۔ وہاں واخان کے علاقے میں افغانی سرزمین کی ایک پتلی سی پٹی پاکستان اور روس کے درمیان واقع ہے بعض بعض جگہوں پر تو یہ پٹی صرف دس میل چوڑی ہے۔ سوویت یونین سے ہمارے تعلقات فی الجملہ اطمینان بخش ہیں اور پچھلے چند سالوں میں تجارت اور بعض دوسرے معاملات میں ہمارے رابطوں میں اضافہ ہوا ہے۔

اس علاقے سے تھوڑا مشرق کی طرف پاکستان کی سرحد کچھ دور تک چین سے متصل ہے اور اس کے پار چینی ترکستان کا صوبہ سنکیانگ واقع ہے۔ اس سرحد کی نشاندہی حال ہی میں ہماری رضامندی سے کی گئی ہے اور یہ بات ہمارے لیے باعثِ اطمینان ہے کہ چین کے ساتھ ہمارا کوئی سرحدی تنازعہ نہیں۔

ہمارے مشرقی بازوؤں کی سرحدیں مشرق میں برما سے ملتی ہیں۔ برما سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں اور ہم دونوں کے مابین کوئی ایسا اختلاف نہیں جو آئندہ کسی پیچیدگی کا باعث ہو۔

ہندوستان سے ہمارے تعلقات کی نوعیت البتہ بہت مختلف ہے۔ پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک ہندوستان سے ہمارے تعلقات مختلف قسم کے مسئلوں میں اُلجھے رہے ہیں۔ اُدھر ۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور چین کے سرحدی جھگڑوں کے بعد سے ہندوستان کی فوجی طاقت میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ آج اُس کی بّری فوج کی تعداد تقریباً

دس لاکھ ہے، اور اس فوج کا بڑا حصّہ مشرقی پنجاب، کشمیر اور مشرقی پاکستان کے اطراف میں مجتمع ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان علاقوں میں فوجیں تعینات کر کے ہندوستان نے اپنی فوجی قوّت چین کی سرحدوں کے قریب پہنچا دی ہے، لیکن اس اقدام کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، اور وہ ہے کہ ہندوستانی فوجیں حکم ملنے کے بعد ذرا ہی دیر میں اِن علاقوں میں اپنے ٹھکانوں سے پاکستان پر حملہ کر سکتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی بری افواج میں اس وقت تین اور ایک کا تناسب ہے، اور ہندوستان کی فضائیہ ہمارے مقابلے میں چوگنی ہے۔ اِس صورت میں اگر ہندوستان کی فوجی قوّت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے تو اُس سے لازماً ہمیں سخت تشویش ہوتی ہے اور ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اس خطرے سے نبٹنے کے لیے ضروری کارروائی کریں۔ ہمارے مغربی حلیف عموماً ہمیں یہ کہہ کر اطمینان دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دولت مشترکہ اور امریکہ کی حکومتیں کبھی یہ برداشت نہ کریں گی کہ کوئی ملک پاکستان پر جارحانہ حملہ کرے، اور یہ کہ ہندوستان کو جو امداد مغربی ملکوں سے مِل رہی ہے اُس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ وہ پاکستان کے خلاف کارروائی کے لیے استعمال کی جائے۔ ہم یہ ماننے کو تو تیار ہیں کہ مغربی ممالک اس مقصد سے ہندوستان کو فوجی امداد فراہم نہیں کر رہے کہ وہ پاکستان کی سرزمین کے کسی حصّے پر قابض ہو جائے، یا اُس کے لیے ایک خطرہ بن جائے لیکن اِس سے آگے بڑھ کر ہم یہ یقین کرنے کو تیار نہیں کہ امریکہ یا دولتِ مشترکہ کے ملک ہندوستان کی طرف سے جارحانہ حملے کے خلاف ہمیں کوئی قابلِ اعتماد ضمانت مہیّا کر سکتے ہیں۔

ماضی قریب میں امریکہ نے کمیونسٹ قوتوں کے خلاف فوجی کارروائیوں

ہیں چند بار حصّہ ضرور لیا، لیکن اِس کے سوا کوئی مثال ایسی نہیں کہ امریکہ کسی دوسرے علاقے کی جنگ میں براہِ راست اُلجھا ہو۔ صاف بات یہ ہے کہ ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اگر ہند و پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو امریکہ یا برطانیہ اپنے آپ کو اس میں اُلجھالے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہمارے ملک پر حملہ ہوا تو اس سے پہلے کوئی باقاعدہ اِعلانِ جنگ نہ ہوگا، بلکہ غالباً حملہ کرنے والا ملک خود اپنے خلاف کسی مفروضہ جارحیت کا بہانہ بنا کر "مدافعتی" جنگ شروع کر دے گا۔ اس کے بعد جو ہنگامہ اور افراتفری ہوگی اُس میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ پہلا حملہ واقعی کس حریف نے کیا۔ اور جب تک یہ واضح ہوگا کہ پہل کس طرف سے ہوئی اُس وقت تک ممکن ہے کہ دشمن ہماری سرزمین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر چکا ہو۔

آپ ذرا مشرقی پاکستان کے نقشے پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ تین طرف سے ہندوستانی سرزمین سے گھِرا ہوا ہے اور وہاں ہندوستان کی فوجی قوّت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ فوجیں کسی وقت بھی مشرقی پاکستان پر کاری ضرب لگانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہیں۔ مغربی پاکستان میں ہمارے تنگ ترین علاقوں کو ہندوستان سے خطرہ درپیش ہے، اور لاہور جو ہمارے مغربی صوبے میں کلچر کا سب سے بڑا مرکز ہے، سرحد سے صرف پندرہ میل دور ہے۔ پنجاب کے میدان کا مغربی علاقہ بکتر بند فوج کی کارروائی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ جنگ کی صورت میں جلد ہی یہ ظاہر ہو جائے گا اور مان بھی لیا جائے گا کہ پہل ہندوستان کی طرف سے ہوئی، تب بھی میرے خیال میں یہ ممکن نہیں کہ دولت مشترکہ یا امریکہ ہندوستان کے خلاف فوجی کارروائی کر کے اُس سے ہمارے مقبوضہ علاقے خالی کرا لیں۔ اب تک اس

قسم کی علاقائی جنگوں میں یہی ہوتا رہا ہے کہ بڑی طاقتوں کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح لڑائی بند کرا دی جائے اور حریفوں کے درمیان مذاکرات شروع کرا دیئے جائیں۔ اور ایک دفعہ گفت وشنید کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر ان طاقتوں کو یہ فکر نہیں رہتی کہ وہ ختم کب ہوگا۔ مثال کے طور پر کوریا کو دیکھئے، جہاں امریکہ خود آج تک مذاکرات میں اُلجھا ہوا ہے۔ یا کشمیر پر نظر ڈالیے، جہاں ہندوستان اب وجہِ نزع پر گفتگو کرنے کو آمادہ ہی نہیں۔ پاکستان کو اب تک مغربی طاقتیں مُبہم لفظوں میں یہ یقین دلاتی رہی ہیں کہ اگر اس پر کوئی جارحانہ حملہ ہوا تو وہ اس کی مدد کریں گی۔ لیکن پاکستان میں اب یہ کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں کہ ہندوستان سے حملے کی صورت میں یہ وعدہ ہمارے کام آئے گا، خصوصاً اِس وجہ سے کہ فوری فوجی کارروائی کے سوا کوئی اور امداد کارگر نہیں ہو سکتی۔ مغربی طاقتوں کی یقین دہانیاں شاید اُسی صورت میں موثر ثابت ہو سکتی ہیں کہ پاکستان کے لیے جارحانہ حملے کے خلاف فوری امداد کی وہی ضمانت مہیّا کی جائے جو "نیٹو" کے ملکوں کو حاصل ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی سرزمین پر دُنیا کی کُل آبادی کا ایک چھٹا حصّہ بستا ہے، اور یہ دونوں باہم مل کر ایشیا میں امن اور استحکام کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایک عرصے سے یہ ملک ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں اور یوں اپنے وسائل اور اپنی توانائیاں ایک ایسے قضیے کے لیے ضائع کر رہے ہیں جو بصیرت، تدبّر اور دور اندیشی سے بہ آسانی طے ہو سکتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہ جھگڑا اسی صورت میں طے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان صدقِ دل سے پاکستان کے

وجود کو تسلیم کرلے اور جموّں وکشمیر کے لوگوں کو اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دے۔ اِس وقت یہ مطالبے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں، اور یہی صورت غالباً آئندہ بھی رہے گی۔ اگر ہندوستان ذرا دوراندیشی سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ خود اس کے مفادات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان دو منصفانہ اور سیدھے سادے مطالبات کو تسلیم کرلیا جائے۔ اگر ہندوستان اپنی ضد پر اڑا رہا اور اس نے پاکستان کی طرف سے اپنا روّیہ نہ بدلا، تو یہ دونوں ملکوں کے لیے بڑی المناک بات ہوگی۔

ضمیمہ (ب)

میں قریشی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اور آپ حضرات سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ قریشی صاحب چاہتے تھے کہ میں "جنگ کی روشنی میں پاکستانی قوم کی پہچان" کے موضوع پر اظہارِ خیال کروں۔ میں اپنی مختصر سی تقریر میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کا پُورا تجزیہ نہیں کرسکوں گا اور صرف ان ایک دو پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ جنھیں میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے بّرصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ کی تین جنگیں ایسی ہیں جنھیں خاص طور پر اسلام کی جنگیں کہا جاسکتا ہے اور جن کے واقعات کی روشنی میں آج پاکستانی قوم اپنے سپاہیانہ کردار کا صحیح تجزیہ کرسکتی ہے۔

لہ لاہور کے ایمبیسیڈر ہوٹل میں ایوانِ اُفکار کے جلسے میں مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۸ء کو تقریر

پہلی دیبل کی جنگ جس میں محمدّ بن قاسم کی فتح کی بدولت مسلمانوں نے سندھ کی سرزمین پر قدم جما لیے تھے اور باقی ہندوستان میں ان کی پیش قدمی کے راستے کھُل گئے تھے۔

دوسری سومنات کی جنگ جس میں محمود غزنوی نے ہندوستان کی متحدہ طاقتوں کو فیصلہ کن شکست دے کر قریباً سات سو برس کے لیے مسلمانوں کی فتوحات کے راستے ہموار کر دیئے تھے۔

یہ دونوں جنگیں ان زمانوں سے تعلّق رکھتی ہیں جب کہ مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے اس ملک میں داخل ہوئے تھے اور ہندوستان سے باہر اُن کی طاقت ور سلطنتوں کے تمام وسائل اُن کی پُشت پر تھے۔ محمدّ بن قاسم اُس زمانے میں آیا تھا۔ جب کہ مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب مشرق میں چین کی سرحدوں اور مغرب میں اسپین تک پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح محمود غزنوی بھی ہندوستان سے باہر ایک عظیم سلطنت کا مالک تھا اور ایشیا کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جو اُس کی قوّت کا مقابلہ کر سکتا۔ جب وہ ہندوستان کا رُخ کرتا تو کئی قوموں اور نسلوں کے سپاہی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

اگر محمدّ بن قاسم یا محمود غزنوی کو کسی میدان میں پیچھے ہٹنا پڑتا تو مسلمان زیادہ قُوّت کے ساتھ دوبارہ حملہ کر سکتے تھے۔

تیسری اہم جنگ پانی پت کی تیسری جنگ ہے اور یہ اُس زمانے میں لڑی گئی تھی جب ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کو زوال آ چکا تھا۔ مرہٹے اس برّصغیر پر ہندو راج کے خواب دیکھ رہے تھے اور مسلمانوں کے لیے

مکمل تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ پھر احمد شاہ ابدالی ان کی مدد کے لیے آیا اور اس نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے لاتعداد لشکر کو شکست دے کر تاریخ کا رُخ بدل دیا۔

اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ایسی ہے جس کے متعلّق ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی قوم کا اجتماعی شعور اور پاکستان کے سپاہی کا کردار وہی تھا جس کا نمونہ دیبل، سومنات اور پانی پت کے مجاہدوں نے پیش کیا تھا۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ نتائج کے لحاظ سے یہ جنگ بھی ان جنگوں کی طرح فیصلہ کُن تھی، یا ہم نے یعنی پاکستان نے اس لڑائی میں ہندوستان کو کوئی ایسی شکست دی ہو جس کے باعث وہ دوبارہ پاکستان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی جُرأت نہیں کر سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جنگ نہ تو فیصلہ کُن تھی اور نہ ہندوستان کو اس جنگ سے اتنا نقصان پہنچا ہے کہ وہ پھر جنگ کے لیے تیّار نہ ہو سکے۔

میرے خیال میں اس تین سال کے عرصے میں ہندوستان کی فوجی طاقت میں کافی اضافہ ہو چکا ہے اور ہماری طاقت بھی پہلے سے کچھ کم نہیں۔ میرے نزدیک اس جنگ کو اس قدر اہمیت دینے کی وجوہات کچھ اور ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ جنگ صرف ہماری آزادی کی جنگ ہی نہ تھی بلکہ بقا کی جنگ بھی تھی۔ پاکستان کو ایک ایسے دشمن کے ساتھ پالا پڑا تھا جس کے ظلم اور تنگ نظری کی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ہندوستان نے تقسیم کے بعد ستر لاکھ مسلمانوں کو ان کے گھروں

سے نکال کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا تھا۔ لاکھوں مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اٹھارہ سال کے بعد ان سے ہار مان لینے سے ہمارا انجام کیا ہوگا؟

ہمارے پیچھے کوئی ایسی قوّت نہ تھی جس کا ہم سہارا لے سکتے کوئی احمد شاہ ابدالی ہماری مدد کے لیے نہیں آسکتا تھا۔ بھارت کے حملے سے صرف پاکستان کی آزادی ہی کو خطرہ نہ تھا بلکہ دس کروڑ انسانوں کی مکمّل تباہی اور ہلاکت کا خطرہ بھی تھا۔ پاکستانی قوم اور پاکستان کے سپاہی کو اس بات کا ثبوت دینا تھا کہ وہ اس خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ ہمارے حوصلے قائم رہے اور ہمارے جوانوں نے اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھا۔

اس جنگ کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ کتنی پاکستانی ایسے تھے جو اس جنگ سے پہلے ہندوستان کے مادی وسائل اور فوج کی تعداد سے مرعوب تھے۔ اور یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اپنے محدود جنگی وسائل کے باعث ہمارے لیے اتنے بڑے ملک کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔

ایسے خیالات صرف پبلک میں ہی نہیں بلکہ حکومت کے بعض اہم شعبوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں ہوائی فوج کے لیے کچھ رقم کی منظوری مانگ رہا تھا تو ایک صاحب نے جو ایک بڑے عہدے پر فائز تھے فرمایا کہ بھائی اگر تمہاری ایئر فورس ہندوستان کی ایئر فورس کے مقابلے میں اتنی چھوٹی ہے تو کیوں

خواہ مخواہ یہ رقم ضائع کرتے ہو۔ آپ اس وقت ان کا چوتھا حصّہ ہیں۔ اگر پانچواں حصّہ رہ گئے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

آج کل کی جنگ میں مشینیں اور قیمتی ہتھیار ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے لڑائی میں بہت مدد ملتی ہے۔

اس لیے یہ غلط فہمی کہ ایک بڑا اور زیادہ طاقتور ملک ایک چھوٹے اور کم وسائل والے ملک پر غالب ہو سکتا ہے، کوئی عجیب بات نہیں۔ مگر آج کل کی جنگ کا نتیجہ بھی بہت حد تک پہلے کی جنگوں کی طرح ہمّت، ایمان اور جنگی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے اور یہ خیال کرنا کہ صرف فوج کی تعداد اور ملک کے وسائل ہی جنگ کے نتیجے کا فیصلہ کرتے ہیں بالکل غلط اور خطرناک بات ہے۔

ستمبر کی مختصر سی جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ تعداد اور اعلیٰ سازوسامان کے علاوہ چند اور باتیں بھی اس معاملے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اب ہندوستان کے رقبے اور تعداد اور اس کے وسائل کا ڈر ہمارے کم ہمّت بھائیوں کے دلوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا ہے اور ہماری قوم اس تجربے سے اپنے آپ کو بہتر طور پر پہچاننے لگی ہے۔

اس کے علاوہ اس جنگ کی اہمیّت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی اتحاد کی یہ پہلی آزمائش تھی اور خُدا کے فضل سے اس امتحان میں ہم پُورے اُترے۔ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے جو محبّت اور حب الوطنی کا اعلیٰ ثبوت دیا اسے ہماری آئندہ

نسلیں ہمیشہ یاد رکھیں گی۔

آخری بات جسے میں بہت ہی اہم سمجھتا ہوں یہ ہے کہ ہماری جنگ ایک ایسی قوم کی آزادی اور بقا کی جنگ تھی جس کی بنیاد ایک خاص نظریے پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور اسلام کی بدولت ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

ہماری یہ نظریاتی بنیاد جس قدر مضبوط ہو گی اسی قدر اس وطن کے ساتھ ہماری محبّت اور وفا کے رشتے پختہ ہوں گے۔ یہ بنیاد جس قدر کمزور ہو گی اُتنا ہی ہم کمزور ہو جائیں گے۔

ہمیں جس قدر پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بیدار رہنے کی ضرورت ہے اسی قدر اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بیدار و ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہماری پہلی ذمّے داری ہے۔ کیونکہ اگر بنیاد ہی ٹوٹ جائے تو کوئی عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی۔

اگر ہم ستمبر کی جنگ کا عرب و اسرائیل کی جنگ سے مقابلہ کریں تو یہ بات زیادہ کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ جب کسی قوم کے اتحاد کی نظریاتی بنیادیں ہل جاتی ہیں تو زبان اور نسل کے رشتے بھی کام نہیں آتے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے چودہ سو برس قبل آپس میں لڑنے والے قبیلوں کو متحد کر دیا تھا اور وہ دُنیا پر

چھا گئے۔ پھر جب ان کے درمیان اسلام کا رشتہ کمزور ہو گیا تو محض عرب ہونے کا فخر انھیں یہودیوں جیسی قوم سے بھی نہ بچا سکا۔ عربوں کی پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ کئی حصّوں میں بٹ گئے اور پھر مغرب کی سازشوں سے یہودیوں کے لیے فلسطین میں پاؤں جمانے کا موقع پیدا ہو گیا۔ اِن کی دوسری غلطی یہ تھی کہ جب اسرائیل جنگ کے لیے پوری تیاریاں کر چکا تھا اور عربوں کو اِن کے ارادوں سے متعلّق کوئی خوش فہمی نہیں رہنی چاہیے تھی تو انھوں نے اپنے اتحّاد کی صحیح بنیادوں کو چھوڑ دیا اور نئی بنیادوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ اس کا جو نتیجہ ہوا اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

ایک ہوشیار دشمن دوسرے فریق پر حملہ کرنے سے پہلے ہمیشہ اس کی قوّت اور اس کے اتحاد کا راز معلوم کر کے اس اتحاد کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر ہمارے اتحّاد اور ہماری طاقت کا راز اسلام کے اُصولوں پر عمل کرنے میں ہے تو ہماری آزادی کے دشمن ہمیشہ اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہمارے درمیان اسلام کا رشتہ کمزور ہو جائے اور وہ ان اندرونی فتنوں کی حمایت کریں گے جو اس رشتے کو کمزور کر سکتے ہوں۔

ستمبر کی جنگ نے پاکستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کو متحد کر دیا تھا لیکن امن کے زمانے میں اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں بہت مستعد رہنا چاہیے۔ ہمیں ان لوگوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ جو ہمارے اندر علاقائی تعصّب پھیلاتے ہیں۔ ہمیں اسلام کو صرف ایک نعرہ بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ہماری نجات اس بات میں ہے کہ ہم اس پر پورے خلوص کے ساتھ

عمل کریں اور یہ اُس صورت میں ممکن ہے کہ ہمارے دل میں خدا کا خوف ہو۔ ہمارا ضمیر روشن ہو اور ذاتی اغراض، لالچ، تعصب اور تنگ نظری ہمیں نیکی اور انصاف کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

ستمبر کی جنگ کے بعد ہمیں اپنی قومی زندگی کی کمزوریاں دور کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم اپنے ماضی سے سبق حاصل نہ کرے اور مستقبل کے متعلق آنکھیں بند کر دے تو قدرت اسے بار بار سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آیندہ چند برسوں یا شاید چند مہینوں میں ہمارا ایمان اور ہمارا رویّہ اس ملک کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالے گا۔